انوشا اور راجا پورس
محمد یونس حسرت

انوشا کی آپ بیتی

دوسرا حصّہ

انوشا اور راجا پورس

بچوں کے لئے ناول

محمد یونس حسرت

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ

پہلی بار ۱۹۷۹

تعداد ۴۰۰۰

قیمت ۴ـ۰۰

فہرست

انوشا کی آپ بیتی

انوشا کی اس حیرت انگیز اور پُر اسرار آپ بیتی کا آغاز آج سے کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے اس وقت ہوتا ہے جب یونان کی ایک چھوٹی سی ریاست مقدونیہ کے بادشاہ فلپ (فیلقوس) کے بیٹے سکندر نے اپنے مُنہ زور سیاہ گھوڑے بیوسی فالس کی باگیں مشرق کی طرف پھیری تھیں اور ایران کی عظیم سلطنت کو روندتا ہوا پنجاب تک آ پہنچا تھا۔ پھر تاریخ کے دھارے کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے یہ داستان تاریخ کے اس نازک اور فیصلہ کُن لمحے پر ختم ہوتی ہے جب دریائے جہلم کے کنارے شیش ناگ کے بیٹے چندر گُپت موریہ نے سیلوکس کو شکست فاش دی تھی، عین اُس جگہ جہاں اِس سے پہلے سیلوکس کے آقا سکندر نے مہاراجا پورس پر

فتح پائی تھی۔

سکندر نے آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے (۳۲۷ قبل مسیح) وادیٔ کابل فتح کرنے کے بعد وادیٔ سندھ کا رُخ کیا تھا، جسے اُس زمانے میں سپت سندھو یعنی سات دریاؤں کی سر زمین کہا جاتا تھا۔ سات دریاؤں کی یہ سر زمین چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں بٹی ہوئی تھی اور یہ ریاستیں اکثر آپس میں لڑتی بھِڑتی رہتی تھیں۔

درّہ مالا کنڈ کے شمال میں اشواک قبیلے کی حکومت تھی، جس کا صدر مقام ساگا تھا۔ پشکلاوتی میں (جس کے کھنڈرات آج بھی چار سدہ مردان کے قریب موجود ہیں) گندھرو قوم کے کنٹک قبیلے کا راج تھا، ہزارہ اور بھمبر کی پہاڑیوں میں راجا امبھی سار حکومت کرتا تھا۔

راجا امبھی سار کی ریاست کے جنوب میں ٹیکسلا کی ریاست تھی جو سندھ سے جہلم تک کے درمیانی علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ٹیکسلا کا راجا امبھی تھا۔ جہلم

اور چناب کے درمیانی علاقے پر راجا پورس کی حکومت تھی جو پورو خاندان پہ سے تعلّق رکھتا تھا۔ ٹیکسلا کا راجا امبھی اس کا بہت بڑا مخالف تھا۔ چناب سے راوی تک کا علاقہ پورس کے ایک رشتے دار کے قبضے میں تھا۔ راوی کے پار کا تھی قبیلے کی حکومت تھی، جس کا صدر مقام سانگا تھا۔ یہ شہر موجودہ امرتسر سے کچھ اُوپر گورداسپور کے ضلع میں تھا۔

سندھ، جہلم، چناب اور راوی کے علاقوں میں مختلف قبیلوں کی حکومتیں قائم تھیں، جن میں ملّہی، سیوی، یادیو اور کشور درک خاص طور سے اپنی شجاعت اور حوصلہ مندی کے لیے مشہور تھے۔

انوشا ٹیکسلا کے راجا امبھی کا بڑا بیٹا تھا۔ اس نے ٹیکسلا کے راج محل میں آنکھ کھولنے کے باوجود ٹیکسلا سے دور اپنی ننھیال پشکلاوتی میں شیش ناگ کے سائے میں پرورش پائی تھی، کیوں کہ نجومیوں کے کہنے کے مطابق راج محل میں رہنا اور راج پاٹ سنبھالنا اس کی قسمت میں نہ تھا۔

انوشا کا بچپن ناگوں کے ساتھ کھیلتے گُزرا تھا۔ زندگی کے ہر موڑ پر شہروں میں، بستیوں میں، راج محلوں میں، جنگلوں میں، وہ جہاں بھی گیا، اس کا سامنا ناگوں سے ہوتا رہا۔ اس کا ایک قدم انسانوں کی دنیا میں تھا اور دوسرا ناگوں کی دُنیا میں۔ اکثر یہ دونوں دُنیائیں یوں گڈمڈ ہو جاتی تھیں کہ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ انسانوں کی دُنیا کون سی ہے اور ناگوں کی دُنیا کون سی۔

اپنی زندگی کے دس سال اس نے پشکلاوتی میں گزارے اور پھر اپنی ماں کے مرنے پر وہ کشمیر کے ایک شہر پرور پُور کی طرف چل دیا۔ پرور پُور میں اس کی بڑی خالہ رہتی تھی جس کا شوہر وہاں تکشک ناگ کے مندر کا پروہت تھا۔ کشمیر کی طرف جاتے ہوئے جب وہ ٹیکسلا سے گزرا تو اسے خبر ملی کہ چند روز پہلے راجا امبھی اور راجا پورس کے درمیان ایک خوفناک لڑائی ہوئی ہے جس میں پورس نے راجا امبھی کو بُری طرح شکست دی ہے۔ وہ اس خبر پر کان دھرے بغیر آگے بڑھ گیا تھا اور اُسے گمان تک نہ تھا کہ ایک روز وہ تاریخ کے دھارے کے ساتھ بہتا ہوا ٹیکسلا آئے گا۔ نہ صرف ٹیکسلا آئے گا بلکہ ٹیکسلا سے مگدھ کے دار

السلطنت پاٹلی پُتر بھی جائے گا۔ (مگدھ کی قدیم سلطنت اس جگہ آباد تھی جہاں اب بھارت کا صوبہ بہار آباد ہے۔ بہار کے دار الحکومت پٹنہ کا پرانا نام پاٹلی پُتر تھا)۔ انوشا اپنی خالہ کے پاس پرور پُور پہنچا تو اندھیر نگری کے دلچسپ واقعے کے بعد اُس کی ملاقات سارنگ بابا سے ہوئی اور وہ اُن کے ساتھ ہو لیا۔

سارنگ بابا کی بدولت انوشا کی زندگی میں ایسے حیرت انگیز واقعات پیش آئے جن کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے ایک چودہ ہاتھ لمبے ناگ سے زندگی اور موت کی جنگ لڑی۔ ایک ایسا ناگ اُن کے ہاتھ سے نکل گیا جسے ابھی ناگ سے انسان بننے کی طاقت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ پھر سارنگ بابا اور انوشا نے ایک عورت کے پیٹ سے سانپ نکالا جو اُس کے پیٹ میں جونک کی طرح چمٹا اُس کا خون چوس رہا تھا۔ یہ عورت سارنگ بابا کے ایک دوست سردار کی بیوی تھی۔ سردار نے اپنی بیوی کی بیماری دُور ہونے کی خوشی میں ایک جشن کیا۔ اس جشن میں طرح طرح کے کھیل تماشے ہوئے اور پھر ایک سپیرا سارنگ بابا کے مقابلے پر آیا۔ اس مقابلے کے نتیجے میں سارنگ بابا اور انوشا کو وہ سانپ ہاتھ آیا

جو اپنی پھُنکار سے پتھّر کو ریزہ ریزہ کر دیتا تھا۔ صرف یہی نہیں، اُس کی پھُنکار اپنے سامنے کی چیزوں کو خُشک لکڑی کی طرح جلا ڈالتی تھی، خواہ وہ چیزیں جان دار ہوں یا بے جان۔ سارنگ بابا نے اُس کا نام شانی رکھا اور اُسے انوشا کا دُودھ شریک بھائی بنا دیا۔

پھر ایک پہاڑی بستی کے قریب ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ثابت کر دیا کہ شانی واقعی انوشا کو اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ شانی کئی دِن کا بھوکا پیاسا تھا اور سارنگ بابا انوشا اور شانی کو ایک غار میں ٹھہرا کر دُودھ لینے گئے ہوئے تھے کہ ایک بھاری چٹان نے لُڑھک کر غار کا دروازہ بند کر دیا۔ اِس پر شانی نے غار کے دروازے پر پڑی ہوئی چٹان کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور یوں انوشا کو غار کی قید سے نجات دِلائی اور اِس کے بعد وہ ویری ناگ کے بیٹے کی طرف روانہ ہوئے۔

یہ انوشا کی آپ بیتی کے پہلے حصّے انوشا کشمیر میں کے واقعات کا خلاصہ ہے۔ اب اس سے آگے کی داستان پڑھیے۔

ویری ناگ کا چشمہ

رات اس بستی کے سردار کے ہاں گزار کر ہم صُبح سویرے ہی وہاں سے چل دیے، اور ویری ناگ کے چشمے سے اِدھر کسی جگہ نہیں رُکے۔ راستے میں کئی بستیاں آئیں اور چند ایک بستیوں میں سارنگ بابا نے سانپ کے ڈسے ہوئے لوگوں کا علاج بھی کیا، لیکن اِس میں کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ سارنگ بابا کا علاج تقریباً ویسا ہی تھا جیسا پرور پُور سے روانہ ہونے کے بعد اُنہوں نے سب سے پہلے مُکھیا کے لڑکے کا کیا تھا۔ اِس کے بعد کہیں ٹھہرنے کے بجائے آگے بڑھتے رہے۔

جب ہم ویری ناگ کے چشمے پر پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔ سارنگ بابا کہنے لگے:

"ہم عین وقت اور عین موقع پر یہاں آئے ہیں، انوشا بیٹے! یہ اماوس کی رات ہے۔ تم جانتے ہی ہو اماوس کی رات گھُپ اندھیرا ہوتا ہے اور آسمان پر چاند بالکل نہیں ہوتا۔ ذرا آرام کر کے تازہ دم ہو لو۔ آدھی رات کے بعد ہمیں اپنا کام شروع کرنا ہے؟"

"کیا کام ہو گا، مہاراج؟" میں نے پوچھا۔

"اس چشمے کی تہہ میں ایک سنہرا ناگ رہتا ہے۔ تمہیں اُس کا مَن حاصل کرنا ہے، لیکن چوری سے نہیں، تحفے کے طور پر۔"

"میں کچھ نہیں سمجھا، مہاراج؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

سارنگ بابا مُسکرائے۔ پھر کہنے لگے۔ "ابھی سمجھائے دیتا ہوں، بیٹے۔ بات یہ ہے کہ جس سانپ کے مُنہ میں مَن ہوتا ہے، وہ ایک انمول خزانے کی طرح اُس کی حفاظت کرتا ہے۔ سپیروں کے لاکھ جتن کرنے پر بھی وہ اُس مَن کو نہیں اُگلتا۔

صرف اماوس کی رات کو وہ باہر نکلتا ہے اور اپنے مَن کو مُنہ سے نکال کر ایک طرف رکھ دیتا ہے اور پھر اُس کی روشنی میں اپنی خوراک کا بندوبست کرتا ہے۔ اچھی طرح پیٹ بھر لینے کے بعد وہ دوبارہ اپنے مَن کو نِگل لیتا ہے۔ سپیرے ایسے سانپ کا برابر پیچھا کرتے ہیں اور کوشش اُن کی یہ ہوتی ہے کہ اماوس کی رات وہ سانپ کے دوبارہ مَن نگلنے سے پہلے پہلے اُسے حاصل کر لیں۔ کئی سپیرے اِس طرح اِس ان مول مَن کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب تک سانپ زندہ رہتا ہے، اپنے مَن کی بُو پر برابر اُس سپیرے کا پیچھا کرتا رہتا ہے، جس نے اُس کا مَن چُرایا ہوتا ہے۔ اس طرح اُس سپیرے کی زندگی ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔ اِسی لیے جو سپیرا اُس سانپ کا مَن حاصل کر لیتا ہے اُس کی کوشش یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اس سانپ کو زندہ نہ چھوڑے۔"

"یہ تو بڑی زیادتی ہے، بابا جی!" میں نے کہا۔

"ہاں، بیٹے۔ اِسی لیے ہم اِس ناگ کے مَن کو نہ تو چوری کریں گے اور نہ اُس کی جان لیں گے۔ وہ خود ہمیں اپنا مَن تحفے کے طور پر دے گا۔ شرط صرف یہ ہے

کہ ہم اپنے آپ کو اُس کی نظروں میں اس تحفے کے قابل ثابت کر سکیں۔"

"یہ کیسے ہو گا، مہاراج؟" میں نے کہا۔ "کیا اِس کا کوئی خاص طریقہ ہے؟"

"کوئی خاص طریقہ نہیں۔ بس اِتنی سی بات ہے کہ اگر ہم اِس ناگ کے تمام وار برداشت کر لیں تو بات بن جائے گی۔ یہ ناگ ایک مدّت سے اِس چشمے میں رہتا ہے اور اب تک بہت سے سپیرے یہاں آکر اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔ یہ ناگ یُوں تو پانی میں رہتا ہے لیکن جب باہر آتا ہے اور شُوں شُوں کرتا ہے تو اُس کے مُنہ سے شُعلے نکلتے محسوس ہوتے ہیں۔ اُس کی پھُنکار سے اِرد گِرد کے درختوں اور جھاڑیوں میں آگ لگ جاتی ہے، اور پھر جب وہ اپنا سانس اندر کی طرف کھینچتا ہے تو کئی سو گز دور کھڑے ہوئے جوان، انسان اور جانور بے بس ہو کر اُس کے مُنہ میں کھِنچ آتے ہیں۔"

"اتنا خوف ناک سانپ ہے یہ؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔ لیکن تم ڈرو نہیں۔ سارنگ بابا اندھا دُھند اپنے بیٹے کو موت کے مُنہ میں

نہیں دھکیلے گا۔ میں نے تُم پر جو محنت کی ہے، وہ یُوں ہی نہیں کی۔ مُجھے تُم پر بھی بھروسا ہے اور اپنے آپ پر بھی۔ بلکہ مُجھے تو شانی پر بھی بھروسا ہے؟“

”شانی پر؟“

”ہاں۔ کیا وہ بھی تمہاری طرح ہمارا بیٹا نہیں ہے؟ کیوں شانی؟“

اور سارنگ بابا کی اس بات پر میرے گلے میں جھُولتے ہوئے شانی نے یُوں سر ہلایا جیسے وہ سارنگ بابا کے سوال کا جواب ہاں میں دے رہا ہو۔ سارنگ بابا مُسکرا دیے۔ پھر اُنہوں نے کہا:

”بس، اب تم آرام کرو۔ وقت آنے پر میں خود تمہیں جگا لوں گا۔“

یہ کہہ کر سارنگ بابا نے پہلے تو شانی کو دُودھ پلایا، پھر اپنے تھیلے سے کچھ پھل نکال کر مُجھے دیے۔ یہ پھل ہم نے چشمے کی طرف آتے ہوئے راستے میں جنگل سے توڑے تھے۔ سارنگ بابا نے خود کُچھ نہیں کھایا، بلکہ سارے پھل مُجھے کھلا دیے۔ پھل کھا کر میں نے چشمے کا پانی پیا اور وہیں ایک طرف لیٹ رہا۔ تھوڑی دیر بعد

ہی مُجھے نیند آ گئی۔

پھر ٹھیک آدھی رات کے وقت سارنگ بابا نے مُجھے جگا دیا۔ میں آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ سارنگ بابا نے میرے تمام کپڑے اُتروا دیے اور میرے بدن پر پاؤں تک کوئی چکنی سی چیز مل دی جو اُنہوں نے تیّار کر رکھی تھی۔ پھر اُسی چیز کو اُنہوں نے شانی کے بدن پر بھی مل دیا۔ اس کے بعد کہنے لگے:

"اب تم چشمے کی طرف مُنہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ میں بِین بجانا شروع کرتا ہوں۔ اپنے آپ پر قابو رکھنا اور اپنی جگہ سے بالکل حرکت نہ کرنا۔ لیکن جب سانپ اپنا مَن اُگلے تو اُسے اپنے ہاتھوں میں لے لینا، نیچے نہ گِرنے دینا۔ سمجھ گئے نا؟"

"ہاں، مہاراج۔" میں نے جواب دیا۔

میں چشمے کی طرف مُنہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ شانی میرے گلے میں جھُول رہا تھا۔ سارنگ بابا نے بِین بجانا شروع کی۔ یہ ایک ایسی دُھن تھی جو اُنہوں نے ابھی تک

مجھے نہیں سکھائی تھی۔

کوئی ایک گھنٹے تک سارنگ بابا بِین بجاتے رہے۔ میں چشمے کی طرف مُنہ کیے پانی پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ رات کی تاریکی کے باوجود مُجھے چشمے کا پانی صاف نظر آ رہا تھا۔ رات کی تاریکی چشمے کے اِرد گرد ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھی۔ لیکن میرے لیے رات کی تاریکی دِن کے اُجالے کی طرح تھی۔ سارنگ بابا کی نظروں نے بہت پہلے میرے لیے دِن اور رات کا فرق مٹا دیا تھا۔

اچانک چشمے کے پانی میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ سُنہری ناگ کا پھَن پانی سے باہر آیا، اُس کے ساتھ ہی اُس نے ایک پھُنکار ماری۔ آگ کا ایک شُعلہ آسمان کی طرف لپکا اور پھر سُنہری ناگ شُوں شُوں کرتا ہوا تیزی کے ساتھ کنارے کی طرف آیا۔ کنارے پر آ کر اُس نے ایک اور پھُنکار ماری۔ ایک شعلہ سا میری طرف بڑھا اور میرے آس پاس جو گھنی جھاڑیاں تھیں، اُن میں آگ لگ گئی۔

سُنہری ناگ پانی سے باہر نکل آیا اور کنارے پر کُنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی وہ

کُنڈلی مار کر بیٹھا، سارنگ بابا نے تیزی سے بِین کی دُھن بدل دی۔ اب بابا وہ دُھن بجا رہے تھے جو اُنہوں نے مُجھے سکھائی تھی۔

اس دُھن کو سُنتے ہی میرے گلے میں جھولتا ہوا شانی بے چین ہو کر اُٹھا اور رینگتا ہوا نیچے زمین پر اُتر گیا۔ سُنہری ناگ نے پھر ایک زور دار پھُنکار ماری۔ آگ کا ایک شُعلہ سا میری طرف بڑھا اور آس پاس کے درخت جل اُٹھے۔ آگ کا یہ شعلہ اگرچہ پہلے کی طرح میرے جسم کو چھُوتے ہوئے گزرا تھا لیکن مجھے صرف یوں محسوس ہوا کا ایک جھونکا میرے جسم کو مَس کرتے ہوئے گُزر گیا ہے۔ کوئی تپش وغیرہ مُجھے محسوس نہیں ہوئی۔

پھر یکا یک بِین کی لَے میں تیزی آ گئی اور اِس کے ساتھ ہی عین میرے قدموں کے پاس ایک پھُنکار بُلند ہوئی۔ یہ پھُنکار شانی کی تھی۔ اُس کو سُن کر سُنہری ناگ ایک دم چونک سا گیا۔ اور اُسی لمحے شانی نے میرے قدموں کے پاس سے مینڈک کی طرح چھلانگ لگائی اور سُنہری ناگ سے گُتھ گیا۔

سارنگ بابا کر شاید پہلے سے اِس کا اندازہ تھا۔ مگر سُنہری ناگ اُن کے اندازے سے زیادہ تیز نکلا۔ شانی نے سُنہری ناگ کی گردن کو، پھَن کے نیچے والی جگہ پر، اپنے مُنہ میں لینے کی کوشش کی تھی، لیکن سُنہری ناگ نے ایک جھٹکے کے ساتھ اُسے نیچے پٹخ دیا اور دوسرے ہی لمحے شانی سالم کا سالم سُنہری ناگ کے پیٹ میں پہنچ چکا تھا۔

مُجھے یُوں محسوس ہوا جیسے زمین میرے پیروں تلے سے کھسکتی جارہی ہے لیکن اصل بات کچھ اور تھی۔ سُنہری ناگ نے اپنا سانس اندر کی جانب کھینچنا شروع کر دیا تھا اور میں بے بس سا ہو کر اُس کی طرف کھنچتا جارہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے یُوں محسوس کیا جیسے میں ایک اندھیرے اور سیلے ہوئے غار میں جا گِرا ہوں۔ یہ غار دراصل سُنہری ناگ کا پیٹ تھا، جہاں میرا دُودھ شریک بھائی شانی پہلے سے موجود تھا۔

لیکن سارنگ بابا نے ہمارے بدن پر جو دوا مل رکھی تھی، اُس کے اثر سے سُنہری ناگ کے پیٹ میں مروڑ اُٹھنے لگا تھا۔ میں اور شانی بھی اُس کے پیٹ میں اچھی

خاصی اُچھل کُود کر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُس نے ہم دونوں کو اُگل دیا اور خود تیزی سے پانی میں اُتر گیا۔

سارنگ بابا، جو ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئے تھے اور شاید اِسی وجہ سے سُنہری ناگ کے مُنہ میں جانے سے بچ گئے تھے تیزی سے آگے بڑھے۔ اُنہوں نے جلدی جلدی ہمارے بدن سے سُنہری ناگ کے پیٹ کی غلاظت صاف کی اور پھر مُجھے تھپکی دیتے ہوئے کہنے لگے:

”شاباش بیٹے، آج میدان ہمارے ہاتھ رہا ہے۔“

پھر وہ شانی کے بدن پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ”شاباش بیٹے! تمہاری ہمّت کا بھی جواب نہیں۔“

ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد اُنہوں نے کہا:

”انوشا بیٹے، مُشکل اور اصل کام یہی تھا جس میں تُم اور شانی اپنی ہمّت اور حوصلے کی بدولت کامیاب رہے۔ اب ہم اسے مہاتالی کی مار دیں گے۔ اِس کے ساتھ

ہماری اگلی جنگ اور انداز میں ہو گی۔ اِس ناگ کو اپنی پھُنکار کی گرمی پر بہت مان تھا، لیکن اُس کی پھُنکار تمہارا بال بیکا نہ کر سکی۔ میں نے تمہارے جسم کو ایسا بنا دیا ہے کہ اِس پر کسی حرارت کا اثر نہیں ہو سکتا۔ پھر اِس ناگ کو اس بات پر بڑا غرور تھا کہ جب اندر کی جانب سانس کھینچتا ہے تو کیا انسان اور کیا حیوان سب بے بس ہو کر اِس کے مُنہ میں کھِنچ آتے ہیں۔ تمہارا اور شانی کا اِس کے پیٹ میں چلے جانا قدرتی بات تھی۔ لیکن میں نے تم دونوں کے بدن پر جو دوا ملی تھی، وہ اِسی لیے تھی کہ ناگ تمہیں واپس اُگلنے پر مجبور ہو جائے۔ جتنی دیر تُم اِس کے پیٹ میں رہے ہو، میں درخت کی اوٹ میں کھڑا بِین بجاتا رہا ہوں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اُس کی جان پر بنی ہوئی ہے، اِسی لیے وہ تمہیں اُگلتے ہی تیزی کے ساتھ پانی میں اُتر گیا۔“

اتنا کہہ کر سارنگ بابا نے ایک لمبا سانس لیا۔ پھر کہنے لگے۔ ”آؤ، اب یہاں سے چلیں، اِسے آرام کرنے دو۔ ہم اگلی جنگ کے لیے تیّاری کریں گے۔“

یہ کہتے ہوئے سارنگ بابا ایک طرف کو چل دیے۔ میں نے جلدی سے کپڑے

پہنے، شانی کو گلے میں ڈالا اور اُن کے ساتھ ہو لیا۔

سُنہری ناگ کا مَن

سارنگ بابا نے چشمے کے قریب، ایک غار میں ڈیرے ڈال دیے اور اُس غار میں میرا مہاتالی کا سبق شروع ہوا۔ سفر کی حالت میں سارنگ بابا نے مُجھے سو نئ دُھنیں سکھائی تھیں، اور یہ سو دُھنیں میں نے نہ صرف چالیس دِنوں میں سیکھ لی تھیں، بلکہ اِکتالیسویں دِن اُنہیں اُسی ترتیب سے بجا کر بھی دِکھا دیا تھا۔ لیکن مہاتالی کی بات ہی کُچھ اور تھی۔ اِس کا سیکھنا میرے لیے ایک آزمائش سے کم نہ تھا اور ایسی آزمائش سے میں اب تک دوچار نہیں ہوا تھا۔

سارنگ بابا صُبح کے وقت مُجھے اِس دُھن کا تھوڑا سا سبق دیتے اور پھر اپنا تھیلا اُٹھا

کر قریبی بستیوں کی طرف نکل جاتے۔ سب سے قریب بستی بھی چار کوس سے کم نہ تھی۔ بابا وہاں سے کھانے پینے کا سامان اور شانی کے لیے دُودھ لاتے۔ اُن کے آنے تک میں اپنے سبق کی مشق کرتا رہتا۔ پھر کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد اُنہیں اپنا سبق سُناتا۔ اگلے دِن وہ اُس کا اگلا حصّہ سِکھاتے اور میں اُس کی مشق کرتا اور پچھلے پہر اُن کو سُناتا۔

اس طرح ایک ایک کر کے تیس دِنوں میں مہاتالی کا سبق پورا ہوا۔ مُجھے اس دُھن کو سیکھنے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑی، اِس کا اندازہ میرے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔ مُجھے خیال تک بھی نہ تھا کہ ایک دُھن سیکھنے کے لیے پورے تیس دِن درکار ہوں گے۔ اِسی لیے سارنگ بابا سے گرو ناگیسن مہاراج کہا کرتے تھے کہ جسے مہاتالی آتی ہو وہ سانپوں کا پورا نہیں تو آدھا بادشاہ ضرور بن جاتا ہے۔

جب سارنگ بابا میری بِین پر مہاتالی شروع سے آخر ایک سُن چُکے تو اُنہوں نے مُجھے گلے لگالیا اور پھر پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے۔

”مجھے تمہاری ہمّت اور محنت کا شروع ہی سے اندازہ تھا، بیٹے۔ میں جانتا تھا کہ انوشا مُجھے مایوس نہیں کرے گا۔ تم مہا تالی صرف تیس دِن میں سیکھ گئے ہوں۔ میں نے ناگیسن مہاراج سے ایک سال میں سیکھا تھا اور میرے ایک ساتھی نے اِسے سیکھنے میں ایک نہ دو پورے دس سال لگا دیے تھے۔“ پھر جیسے اُنہیں کُچھ یاد آ گیا۔ وہ بولے۔ ”آج ہی تُم نے مہاتالی کا سبق پورا کیا ہے اور آج ہی تمہارا امتحان ہو گا۔ آج اماوس کی رات ہے نا۔ آج سُنہری ناگ کے ساتھ ہمارا دوسرا معرکہ ہو گا۔ مجھے اُمّید ہے کہ میدان اِس بار بھی ہمارے ہاتھ رہے گا۔“

اِس کے بعد اُنہوں نے مُجھے سمجھایا کہ کیا کُچھ کرنا ہے اور کب اور کیسے کرنا ہے۔ پھر وہ کہنے لگے:

”اب تُم آرام کر لو۔ آدھی رات سے ذرا پہلے میں تمہیں جگا لوں گا۔“

میں غار کے ایک کونے میں لیٹ گیا اور ذرا دیر بعد ہی گہری نیند سو گیا۔

آدھی رات سے ذرا پہلے سارنگ بابا نے مُجھے اُٹھایا اور میں اُن کے ساتھ چشمے کی

طرف چل دیا۔

چشمے پر پہنچ کر سارنگ بابا نے شانی کو میرے گلے سے اُتارا اور اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُنہوں نے پھَن سے ذرا نیچے شانی کی گردن مضبوطی سے تھام لی اور مُجھے بِین بجانے کا اشارہ کیا۔ میں نے وہی آخری، سوویں دُھن شروع کی جو سارنگ بابا نے مُجھے سکھائی تھی اور جِسے میں نے سردار کی بیوی کی بیماری دور ہو جانے کی خوشی میں منائے جانے والے جشن میں بجایا تھا۔ یہ دُھن شانی کی دُھن تھی۔

میں بِین بجاتا رہا اور شانی سارنگ بابا کے ہاتھ میں بے چینی سے بَل کھاتا رہا۔ جیسے جیسے بِین کی لَے تیز ہوتی گئی، شانی کی بے چینی میں اضافہ ہوتا گیا۔

پھر اچانک سارنگ بابا نے شانی کی گردن چھوڑتے ہوئے اُس کا رُخ چشمے کی طرف کر دیا۔ آگ کا ایک شُعلہ سا چشمے کی طرف لپکا اور اُس کا سارا پانی بھاپ بن کر اُڑ گیا۔ چشمے کی تہہ صاف نظر آ رہی تھی اور اِس تہہ میں سُنہری ناگ منڈلی مارے بیٹھا تھا۔

سُنہری ناگ کو دیکھتے ہی شانی بے قابو ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ لپک کر سُنہری ناگ سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے چشمے کی تہہ میں پہنچ جائے کہ سارنگ بابا نے تیزی سے آگے بڑھ کر اُسے پکڑ لیا اور بچّے کی طرح چمکارتے ہوئے بولے۔

”نہیں، شانی بیٹے۔ تمہارا کام بس اتنا ہی تھا۔ اب ہماری باری ہے۔“

سارنگ بابا کے یہ الفاظ سُنتے ہی شانی ایک فرمان بردار بچّے کی طرح خاموش ہو گیا۔ میں نے اُسے سارنگ بابا سے لے کر اپنے گلے میں ڈال لیا اور پھر سارنگ بابا کے اشارے پر چشمے کے دوسری طرف جا پہنچا۔ اِس کے بعد دونوں نے اپنی اپنی بِین پر مہا تالی کی دُھن بجانی شروع کر دی۔

مہا تالی کی دُھن شروع ہوتے ہی سُنہری ناگ نے ایک جھُرجھُری لی اور چاروں طرف سر کو گھُماتے ہوئے شُوں شُوں کرنے لگا۔ اُس کے شُوں شُوں کرنے کی دیر تھی کہ چشمے میں، جس کا پانی شانی کی پھُنکار نے بھاپ بنا کر اُڑا دیا تھا، دوبارہ نہ جانے کس طرف سے پانی آنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دوبارہ پانی سے بھر گیا۔

لیکن اِس کے ساتھ ہی سُنہری ناگ بھی پانی کی سطح پر آ گیا۔

پانی کی سطح پر آنے کے بعد سُنہری ناگ پر وہ کُچھ بنی جس کا مُجھے گُمان تک نہیں تھا۔ دو مخالف سمتوں سے آتی ہوئی مہاتالی کی دُھنیں اُس پر برابر اثر کر رہی تھیں۔ کبھی وہ میری طرف آتا اور کبھی سارنگ بابا کی طرف جاتا۔ پھر پلٹ کر میری طرف آتا اور میری طرف سے پلٹ کر پھر سارنگ بابا کی طرف جاتا۔ کبھی وہ میری بِین کی آواز پر مست ہو کر آتا اور کبھی سارنگ بابا کی بِین کی آواز اسے اپنی طرف کھینچتی۔ میں اور سارنگ بابا پُورے جوش سے بِین بجاتے رہے اور سُنہری ناگ چشمے کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف اور دوسرے سے پہلے کی طرف دیوانوں کی طرح دوڑتا رہا۔

اِس بھاگ دوڑ نے آخر اُسے تھکا دیا اور اُسے حرکت کرنا دشوار محسوس ہونے لگا۔ اِس مرحلے پر سارنگ بابا نے بِین بجانی بند کر دی اور خود بھی اُس کنارے پر آ گئے جہاں میں کھڑا بِین بجا رہا تھا۔

سُنہری ناگ آہستہ آہستہ پانی کی سطح پر رینگتے ہوئے میری طرف آیا اور بڑی مُشکل سے پانی سے باہر نِکل کر کُنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک اِس طرح چُپ چاپ بیٹھا رہا جیسے کوئی اپنا کھویا ہوا سانس دُرست کر رہا ہو۔

پھر اُس نے اپنا مُنہ کھولا اور مَن اُگل دیا۔ اندھیری رات میں جیسے ہزاروں بجلیاں کوند گئیں۔ میں اِس کے لیے پہلے سے تیّار تھا۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر مَن کو زمین پر گرنے سے پہلے ہی اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

سارنگ بابا نے دُودھ کے دو برتن پہلے سے وہاں رکھ چھوڑے تھے۔ اُن کے اشارے پر میں نے مَن کو دُودھ کے ایک برتن میں ڈال دیا۔ دوسرا برتن اُنہوں نے اُٹھا کر سُنہری ناگ کے آگے کر دیا۔

سُنہری ناگ تو چُپ چاپ دُودھ پینے لگا، لیکن جِس برتن میں مَیں نے اُس کا مَن ڈالا تھا، اُس کی عجیب حالت ہوئی۔ مَن کے ڈالتے ہی سارا دُودھ ایک دم یوں اُبلنے لگا جیسے اُسے بہت تیز آنچ پر رکھ دیا گیا ہو۔ یہ سب مَن کی گرمی کا اثر تھا۔

دُودھ کے کھولتے ہی سارنگ بابا نے مُجھے اشارہ کیا اور میں وہ سارا دُودھ ایک ہی سانس میں پی گیا۔ کھولتا ہوا دُودھ مُجھے ذرا بھی گرم نہیں لگا۔ لیکن اِس سے زیادہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ سُنہری ناگ کا وہ مَن جو میں نے اِس برتن میں ڈالا تھا، اب اُس میں موجود نہ تھا۔ میں نے حیرت سے کہا۔

"بابا جی! وہ مَن کہاں گیا؟"

سارنگ بابا مُسکرا دیے اور بولے۔ "ابھی جو دُودھ پیا ہے تم نے۔۔۔۔"

"لیکن اُس میں مَن تو نہیں تھا، مہاراج!"

سارنگ بابا کُچھ کہنے والے تھے کہ جھپاک کی سی آواز آئی۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ سُنہری ناگ دُودھ پی لینے کے بعد واپس چشمے میں اُتر گیا تھا۔ سارنگ بابا کہنے لگے: "آؤ، اب واپس چلیں۔ ہمارا کام ختم ہو چکا ہے۔"

"لیکن وہ مَن کہاں گیا، مہاراج؟" میں نے بے چینی سے کہا۔

"تمہارے پیٹ میں۔" سارنگ بابا ہنستے ہوئے بولے۔ "حکیم اور وید شربت میں موتی اور ہیرے حل کر کے بادشاہوں کو پِلاتے ہیں۔ میرے بادشاہ تُم ہو۔ میں نے سُنہری ناگ کا مَن دُودھ میں حل کر کے تمہیں پِلا دیا ہے۔ سانپ کا مَن حاصل کر لینا کوئی کمال نہیں ہے، بیٹے۔ سانپ کے مَن کو اپنے بدن کا جزو بنا لینا کمال ہے۔ یہ کمال میرے گُرو ناگیسن مہاراج میں تھا۔ یہ کمال تمہارے سارنگ بابا میں ہے، اور اب یہ کمال تُم میں بھی ہے۔ آج سے سُنہری ناگ کے مَن کی تمام خوبیاں تمہارے بدن میں آ گئی ہیں۔ اور ابھی دیکھنا تو سہی، آگے کیا کیا ہوتا ہے۔ تُم وہ کُچھ بن جاؤ گے کہ بڑے بڑے راجا تمہارے آگے سر جھکائیں گے۔ بڑے بڑے بہادر تمہارے سامنے کان پکڑیں گے اور ماتھا رگڑیں گے۔ میں تمہیں یُوں ہی اپنے ساتھ نہیں لایا ہوں۔"

سارنگ بابا کے اِن الفاظ سے مُجھے اپنے باپ راجا امبھی کے دربار کے نجومی یاد آ گئے۔ اُنھوں نے میرے پیدا ہونے پر یہی الفاظ کہے تھے۔ لیکن شاید اُنہیں یہ اندازہ نہ تھا کہ اُن کی یہ بات کب، کہاں اور کیسے پوری ہو گی!

چالیس دِن کا فاقہ

غار کی طرف واپس آتے ہوئے مُجھے اپنے آپ میں غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے زمین آسمان کی ساری آگ اور ساری بجلیاں میرے وجود میں سما گئی ہیں۔ یہ اُس سُنہری ناگ کے مَن کا اثر تھا جسے سارنگ بابا نے دُودھ میں حل کر کے مُجھے پلا دیا تھا۔

غار میں پہنچ کر سارنگ بابا مُجھ سے کہنے لگے۔ "انوشا بیٹے، آج سے تمہاری تربیت کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ سنہری ناگ کا مَن تُم دُودھ میں گھول کر پی چکے ہو اس کا اثر بھی تمہیں اپنے وجود میں صاف محسوس ہو رہا ہے لیکن ضروری بات

یہ ہے کہ اِس کی تمام صفتیں پُوری طرح تمہارے وجود میں رچ بس جائیں۔ اِس لیے آج سے چالیس دِن تک تم بالکل اکیلے رہو گے۔ نہ کُچھ کھاؤ گے اور نہ کچھ پیو گے اور نہ زبان سے کوئی بات کرو گے۔ یہ چالیس دِن تُم اِسی غار میں رہو گے اور اکتالیسویں دِن ٹھیک آدھی رات کے وقت چشمے پر پہنچ کر سُنہری ناگ کو آواز دو گے۔ وہ تمہارے لیے ایک ایسا کھانا لے کر آئے گا جو تُم نے اِس سے پہلے کبھی نہیں کھایا ہو گا۔"

یہ کہہ کر سارنگ بابا دم بھر کو رُکے۔ پھر کہنے لگے: "اس کے ساتھ ہی میں تمہیں ایک منتر بھی بتا دیتا ہوں۔ اس کا جاپ کرتے رہنا۔ اِس سے تمہیں وقت گزارنے میں آسانی ہو گی، اور تمہاری روحانی طاقتوں میں بھی اضافہ ہو گا۔ تمہارا یہ جاپ ابھی سے شروع ہو جاتا ہے۔ شانی کو میں اپنے ساتھ لیے جاتا ہوں۔ ٹھیک اِکتالیسویں دِن، آدھی رات کے وقت تُم مُجھے چشمے کے کنارے موجود پاؤ گے۔"

یہ کہہ کر سارنگ بابا نے شانی کو میرے گلے سے اُتار کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور

غار سے باہر نکل گئے۔ میں اُن کی ہدایت کے مطابق غار کے فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اُن کے بتائے ہوئے منتر کا جاپ کرنے لگا۔ کوئی ایک پہر تک جاپ کرنے کے بعد مُجھ پر نیند طاری ہونے لگی اور میں جاگتے رہنے کی کوشش کے باوجود نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

آنکھ کھُلی تو باہر دِن کا اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں غار سے نکلا اور چشمے پر آیا۔ نہا دھو کر تازہ دم ہونے کے بعد پھر غار میں گیا اور فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ صُبح کا بیٹھا ہوا شام اور پھر آدھی رات گئے تک منتر پڑھتا رہا۔ اس دوران میں مجھے نہ تو بھوک محسوس ہوئی اور نہ پیاس ہی لگی۔ ہاں سارے جسم میں انگارے اور بجلیاں سی اب بھی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کے بعد مجھے نیند نے آلیا۔

ایک دِن۔۔۔۔ دو دِن۔۔۔ تین دِن۔۔۔۔ اور۔ ایک کے بعد دوسرا دِن، ایک ایک کر کے گزرتے گئے۔ مُجھے نہ تو بھُوک نے ستایا اور نہ پیاس نے تنگ کیا۔ جسم میں کسی قسم کی کمزوری بھی معلوم نہ ہوتی تھی۔ صرف اکیلے ہونے کا خیال ذرا پریشان کرتا تھا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو منتر کے جاپ میں کُچھ اِس

طرح گُم کر لیا تھا کہ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں صدیوں سے اِس غار میں اکیلا رہتا اور اِسی طرح جاپ کرتا آرہا ہوں۔ بجلیاں اور انگارے جو پہلے دِن مُجھے اپنے وجود میں بھرے ہوئے محسوس ہوئے تھے، اب یوں لگتا تھا جیسے وہ میرے خون میں گھُل مل گئے ہیں۔ شاید یہی سارنگ بابا بھی چاہتے تھے۔ اکتالیسویں دِن، ٹھیک آدھی رات کو، میں غار سے نکل کر چشمے کے کنارے پر پہنچا۔ سارنگ بابا مُجھ سے پہلے وہاں موجود تھے۔ اُنہوں نے آگے بڑھ کر مُجھے اپنی آغوش میں کھینچ لیا اور پیشانی چومتے ہوئے بولے:

"شاباش، انوشا بیٹے! تُم نے بڑی ہمّت دِکھائی ہے۔ مُجھے تم سے ایسی ہی آس تھی۔"

"شانی کہاں ہے، بابا جی؟" میں نے پوچھا۔

"اسے میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں، بیٹے۔" سارنگ بابا بولے۔ "مناسب بھی یہی تھا۔ لو اب تم ناگ کو آواز دو کہ تمہارا چالیس دِن کا بھوکا پیاسا بھائی تمہارے دروازے

پر آیا ہے۔ آؤ، اور اسے کھانا کھلاؤ۔"

سارنگ بابا کے کہنے کے مطابق، میں نے اپنے گلے کی پوری طاقت سے پُکار کر کہا: "اے ویری ناگ کے سُنہری ناگ! تمہارا چالیس دِن کا بھوکا پیاسا بھائی تمہارے دروازے پر آیا ہے۔ آؤ، اور اِسے کھانا کھلاؤ۔"

میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ چشمے کی سطح پر ہل چل سی ہوئی۔ سُنہری ناگ تیزی سے کنارے کی طرف آیا۔ کنارے پر آ کر اس نے منہ کھولا اور ایک سیب زمین ڈال دیا۔ پھر دوبارہ پانی میں غوطہ مار گیا۔ ذرا سی دیر بعد اس نے ایک اور سیب کنارے پر لا کر ڈال دیا۔ پھر ایک اور۔۔۔۔۔ پھر ایک اور۔۔۔۔ تھوڑی ہی دیر میں میرے سامنے سیبوں کا ڈھیر لگ گیا۔ میں حیرانی سے اِن سیبوں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ چشمے کے اندر یہ سیب کہاں سے آ گئے! ایسے گہرے سُرخ رنگ کے سیب میں نے آج تک نہیں دیکھے تھے۔

"حیران کیا ہو رہے ہو، انوشا بیٹے۔" سارنگ بابا بولے۔ "کھاؤ اور اپنے بھائی کی

محبّت اور مہمان نوازی کی داد دو۔"

"اپنے بھائی کی محبّت اور مہمان نوازی!" میں نے اور بھی حیران ہو کر کہا۔ "میں کُچھ نہیں سمجھا، مہاراج!"

سارنگ بابا ہنس کر بولے۔ "ارے مورکھ! اس نے تمھیں اپنا مَن دیا تھا۔ اس کے بعد تُم دونوں نے ساتھ ساتھ دُودھ پیا تھا۔ اس طرح تم دونوں دُودھ شریک بھائی بن گئے۔ شانی کی طرح۔۔۔۔ تم نے اس کے سامنے ہی وہ دُودھ پیا تھا جس میں اُس کا مَن گھُل گیا تھا۔ اِسے اپنے مَن کی تاثیر کا عِلم ہے۔ اِسے معلوم تھا کہ اِس کا مَن دُودھ میں گھول کر پینے کے بعد تم چالیس دِن تک کُچھ کھاؤ گے اور نہ کچھ پیو گے۔ اور پھر اکتالیسویں دِن آدھی رات کر یہاں آؤ گے۔ یہ سیب چشمے کے اندر کے نہیں بلکہ اِرد گرد کے درختوں کے ہیں جو اُس نے پہلے سے تمہارے لیے جمع کر رکھے تھے۔ آخر اپنے بھائی کی دعوت کرنا اِس کا فرض تھا۔ لو، میں نے تمھیں ساری بات بتادی ہے۔ اب یہ سیب کھاؤ اور اپنے بھائی کی محبّت اور مہمان نواز کا شکریہ ادا کرو۔"

سامنے سُرخ سُرخ سیبوں کا ڈھیر لگا دیکھ کر میری چالیس دِن کی بھوک ایک دم جاگ اُٹھی۔ میں ندیدوں کی طرح اِن سیبوں پر ٹوٹ پڑا اور ذرا سی دیر میں سارے سیبوں کا صفایا کر ڈالا۔ بڑے ہی میٹھے سیب تھے۔ سیب کھا کر میں نے ڈکار لی اور پھر بُلند آواز سے کہا:

"اسے ویری ناگ کے سُنہری ناگ! اے میرے بھائی! تمہاری محبّت اور مہمان نوازی کا بے حد شکریہ۔ تمہاری یہ دعوت مُجھے زندگی بھر نہیں بھولے گی۔"

"ابھی کہاں۔ ابھی تو تمہیں یہ دُودھ پینا ہے۔" سارنگ بابا نے ہنستے ہوئے کہا اور قریب پڑے ہوئے دُودھ کے برتن کی اشارہ کیا۔

میں حیران ہو کر بول اُٹھا۔ "تو کیا یہ دُودھ بھی سُنہری ناگ ہی لایا ہے؟"

"بس یہی سمجھ لو بیٹے۔" سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے بولے۔

"میں سمجھا نہیں، مہاراج۔" میں نے کہا۔

"بات یہ ہے، انوشا بیٹے، لوگ اس چشمے کو مقدّس سمجھتے ہیں اور ہفتے کے ہفتے اِس ناگ کے لیے دُودھ سے بھرے برتن کنارے پہ رکھ جاتے ہیں۔ یہ وہ دُودھ ہے جو اِس ناگ کے لیے لایا گیا تھا، لیکن اِس نے خود پینے کے بجائے تمہارے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ تمہارا بھائی جو ہوا۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں اکیلا یہ دُودھ نہیں پیوں گا۔ دونوں پئیں گے۔ میں اُسے ابھی آواز دیتا ہوں۔" اور میں نے بُلند آواز سے کہا۔ "اے ویری ناگ کے سُنہری ناگ! اے میرے بھائی! آؤ اور میرے ساتھ مل کر یہ دُودھ پیو۔"

میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا لیکن پانی میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سُنہری ناگ کو میری پیش کش منظور نہیں ہے۔ اس پر میں نے دوبارہ کہا:

"اے ویری ناگ کے سنہری ناگ! اے میرے بھائی جلدی آؤ اور میرے ساتھ یہ دُودھ پیو۔ اگر تم نہیں آؤ گے تو میں تُم سے ناراض ہو جاؤں گا اور دُودھ پیئے بغیر چلا جاؤں گا۔"

اس پر چشمے کے پانی میں حرکت ہوئی۔ سنہری ناگ پانی کی سطح پر ظاہر ہوا اور تیرتا ہوا کنارے کی طرف آیا۔ پھر اُس نے اپنا بھاری بھر کم جسم پانی سے نکالا اور کنارے پر کُنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ میں نے برتن اُٹھا کر مُنہ لگایا اور آدھا دُودھ پی کر برتن اُس کے آگے رکھ دیا۔ سُنہری ناگ دُودھ پینے لگا لیکن اُس کی نظریں مُجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

دُودھ پی کر اُس نے میری طرف محبّت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر پانی میں غوطہ مار گیا۔

"کہو، اب تو خوش ہو انوشا بیٹے۔" سارنگ بابا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں، بابا جی۔" میں نے جواب دیا۔

"تو آؤ، اب چلیں۔" سارنگ بابا بولے۔ "شانی تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔"

ایک خوفناک دعوت

میرا خیال تھا کہ سارنگ بابا نے کہیں آس پاس ہی کسی غار میں اپنا ٹھکانا بنالیا ہو گا لیکن میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب سارنگ بابا نے کہیں رُکنے کا نام ہی نہ لیا۔ چلتے چلتے صُبح ہو گئی تو میں نے کہا:

"یہ ہم کہاں جارہے ہیں، مہاراج؟"

"شانی کے پاس۔" سارنگ بابا نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن شانی ہے کہاں، مہاراج؟"

”شہر بھوگ متی کے راجا ناگ سین کے محل میں۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”جتنے دِن تُم نے ویری ناگ کے پاس غار میں گزارے ہیں، اتنے ہی دِن ہم۔۔۔ میں اور شانی۔۔۔ راجا ناگ سین کے مہمان رہے ہیں۔ اب تم ان کے مہمان بنو گے، ویری ناگ کے سُنہری ناگ کی دعوت کے بعد اب راجا ناگ سین کی دعوت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ وہ دعوت پانی کے راجا کی تھی، یہ دعوت خُشکی کے راجا کی ہے۔“

اتنا کہہ کر سارنگ بابا خاموش ہو گئے۔ اور پھر سارا دِن چلتے رہے۔ شام ہو رہی تھی، جب ہم شہر بھوگ متی کے دروازے پر پہنچے۔

شہر کے دروازے پر راجا کے سپاہی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ہمیں سیدھے راجا کے محل میں لے گئے۔ ہمارے آنے کی خبر ہوتے ہی راجا بھا گا بھا گا آیا۔ اُس سارنگ بابا کے قدم چھوئے اور پھر میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور پھر کہنے لگا:

”بڑی راہ دکھائی، مہاراج۔ شکر ہے کہ آج آپ کے درشن ہوئے۔ جیسا سُنا تھا،

اُس سے کہیں بڑھ کر پایا۔"

راجاناگ سین اُدھیڑ عُمر کا آدمی تھا۔ اُسے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے دیکھ کر مجُھے بڑی حیرت ہوئی اور اُس کی باتوں نے مجُھے اور بھی حیرت میں ڈال دیا۔ کیا اِسے میرا انتظار تھا؟ اس نے میرا ذکر کس سے سُنا تھا؟ کب سُنا تھا؟ میرے ذہن میں گھومتے ہوئے یہ سوال زبان پر آیا ہی چاہتے تھے کہ سارنگ بابا نے جیسے میری حیرانی بھانپ لی اور مجُھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

راجاناگ سین ہمارے ساتھ محل کے اس حصّے تک آیا جو ہمارے ٹھہرنے کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ پھر اس نے سارنگ بابا سے کہا:

"مہاراج! آپ جانتے ہیں کہ فقیروں اور جوگیوں کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ میرا شہر یہاں آنے والے ہر جوگی کا استقبال کرتا ہے اور ہر جوگی اور فقیر کے لیے میرے محل کے دروازے دِن رات کھُلے رہتے ہیں۔ لیکن آپ کی اور انوشا مہاراج کی بات ہی دوسری ہے۔ میں اُسی وقت سے آپ اور انوشا مہاراج کا

انتظار کر رہا تھا جب آپ اور انوشا مہاراج نے میرے دوست سر دار کی بیوی کے پیٹ سے سانپ نکالا تھا۔ سر دار میرا پرانا دوست ہے اور اُس نے اپنی بیوی کے تندرست ہونے پر جو جشن کیا تھا، اس کا سارا حال مُجھ تک پہنچ چکا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اور انوشا مہاراج بڑے پہنچے ہوئے جوگی ہیں، اِس لیے اگر آپ کی خدمت میں مُجھ سے کوئی کوتاہی ہو جائے تو انوشا مہاراج سے خاص طور درخواست ہے کہ وہ مُجھے معاف کر دیں۔"

راجا ناگ سین کی اِس بات کے جواب میں مَیں کُچھ کہنے ہی لگا تھا کہ سارنگ بابا نے پھر مُجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور راجا سے کہنے لگے: "یہ تُم خواہ مخواہ کا تکلّف کر رہے ہو، میرے دوست۔ آخر ہمیں یہاں رہتے چالیس دِن ہو گئے ہیں۔۔۔۔!"

"لیکن مہاراج۔" راجا ناگ سین نے جلدی سے کہا۔ "انوشا مہاراج تو آج ہی یہاں آئے ہیں۔"

”تُم فکر نہ کرو۔“ سارنگ بابا نے کہا۔ ”یہ میرا بیٹا ہے۔ جب باپ کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہوئی تو بیٹے کو بھی نہیں ہو گی۔ ویسے بھی ہم جوگی لوگ کوئی شکایت نہیں کیا کرتے۔ تم جاؤ اور اطمینان سے اپنے کاموں کی طرف توجّہ دو۔“

”جو حکم مہاراج۔“ راجا ناگ سین نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

راجا کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ”یہ سب کیا ہے بابا جی، میں کُچھ نہیں سمجھا۔“

سارنگ بابا مُسکرا کر بولے۔ ”سمجھ جاؤ گے۔ سب کُچھ سمجھ جاؤ گے۔“

”شانی کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔ ”آپ نے تو کہا تھا کہ ہم شانی کے پاس جا رہے ہیں!“

سارنگ بابا نے کُچھ جواب دینے کے بجائے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر مجُھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں چُپکا ہو رہا۔ ذرا دیر بعد محل کا ایک نوکر ہمارے لیے کھانا لے کر آ گیا۔ بالکل سادہ سا کھانا تھا۔ چند چپاتیاں، بگھاری ہوئی دال اور چند پھل۔ اِس کھانے کو دیکھ کر یہ گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ کسی راجا کے محل سے بھیجا گیا

ہے۔ میں نے خاموشی سے یہ کھانا کھالیا۔

کھانے کے بعد ہم لیٹ گئے۔ ویسے تو میں سارنگ بابا سے ایک دو نہیں، ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ باتوں کے بجائے خاموشی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اِس لیے کھانے کے بعد میں خاموشی اپنے بستر پر لیٹ گیا اور پھر جلد ہی گہری نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

آدھی رات کے قریب سارنگ بابا نے مُجھے جگا دیا۔ وہ میرا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے بولے:

”اُٹھو، انوشا بیٹے! وہاں کب سے تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔“

میں آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھا اور حیرت سے بولا۔ ”کہاں انتظار ہو رہا ہے، مہاراج؟“

”دعوت میں!“ سارنگ بابا بولے۔ ”چلو جلدی کرو۔ باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔“

میں فوراً اُٹھا اور سارنگ بابا کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مُجھے ساتھ لیے محل سے باہر نکلے اور آگ کے اُس الاؤ کی طرف بڑھے جو کُچھ فاصلے پر جلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ یہ ایک خاصا لمبا چوڑا میدان تھا جس کے درمیان میں آگ کا الاؤ روشن تھا۔ اِس الاؤ سے ذرا ہٹ کر ایک لاش پڑی تھی، اور اِس لاش سے کوئی بیس گز کے فاصلے پر کُچھ لوگ کھڑے تھے۔ میں نے اُن لوگوں کی طرف ایک نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ اُن کے چہروں پر خوف کی پرچھائیاں رینگ رہی ہیں۔ اُن میں راجا ناگ سین بھی تھا۔

سارنگ بابا نے فوراً ہی مُجھے ساری بات بتا دی۔ الاؤ کے قریب رکھی ہوئی لاش ایک ایسے شخص کی تھی جو اگرچہ راجا ناگ سین کا بھائی تھا لیکن راج محل میں رہنے کے بجائے گلی کوچوں میں ننگ دھڑنگ پھرا کرتا تھا۔ لوگ باگ اُسے زبردستی کِھلاتے پلاتے تھے اور اب بھی اُسے کوئی کپڑا پہنایا جاتا، وہ اس کے چیتھڑے کر دیا تھا۔ راجا ناگ سین نے بڑی کوشش کی تھی کہ وہ اس طرح پھرنا چھوڑ دے اور راج محل میں یا کسی اور مکان میں رہے، لیکن اُس کی تمام کوششیں

ناکام رہی تھیں۔ کئی دفعہ راجانے اُسے محل میں لا کر کڑی نگرانی میں رکھا تھا لیکن ہر بار وہ کسی نہ کسی طرح محل سے بھاگ جاتا تھا۔ تھک ہار کر اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ ہاں راجانے اتنا ضرور کیا تھا کہ اپنے کُچھ آدمیوں کے ذمّے یہ کام لگا دیا تھا کہ وہ برابر اُس کے ساتھ کُچھ فاصلے پر رہ کر اُس کی خبر گیری کرتے رہیں۔ یہی لوگ زبردستی اُسے کھانا کھلاتے تھے اور کبھی کبھی اُسے لباس بھی پہنانے کی کوشش کرتے تھے۔

لیکن راجاناگ سین کا یہ فقیر بھائی بہت کم بات کرتا تھا۔ لیکن جب بھی زبان کھولتا تو اُس کی زبان سے نکلی ہوئی بات ضرور پوری ہوتی۔ سارنگ بابا کے آنے سے ایک دِن پہلے اُس نے بھرے بازار میں "سارنگ بابا آگیا!" کا نعرہ لگا کر ناچنا شروع کر دیا تھا اور میرے آنے سے تین روز پہلے اُس نے لوگوں کو اپنی زبان دِکھا کر کہا تھا:

"یہ زبان انوشا کی ہے۔۔۔ انوشا کی ہے۔۔۔ انوشا کی ہے۔"

اس نے سارنگ بابا سے شانی کو یہ کہہ کر مانگ لیا تھا کہ یہ میرا آخری وقت کا ساتھی ہے اور شانی بھی اُس کے ساتھ ایسا مانوس ہو گیا تھا جیسے وہ اور شانی جنم جنم کے ساتھی ہوں۔ وہ شانی کو اپنے ننگ دھڑنگ جسم کے ساتھ یوں چمٹائے رکھتا تھا جیسے کوئی ماں اپنے بچّے کو سینے سے چمٹائے رکھتی ہے۔ اُسے اپنے آخری وقت کا بھی شاید پہلے سے علم ہو گیا تھا۔ مرنے سے ایک روز پہلے وہ اِس میدان میں چارپائی ڈلوا کر اُس پر آ بیٹھا تھا اور اُس کے کہنے کے مطابق چارپائی کے قریب آگ کا الاؤ راشن کر دیا گیا تھا۔ پھر اُس نے چُپ چاپ دم توڑ دیا تھا۔ شانی اُس وقت بھی اُس کے جسم سے چمٹا ہوا تھا۔ لوگ خوف بھرے انداز سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن سب کو میرا انتظار تھا۔ اِس لیے کہ وہ مرنے سے ذرا پہلے آگاہ کر گیا تھا کہ ”خبردار! انوشا کے سوا اور کوئی میرے پاس نہ آئے۔“

اور اب انوشا آ گیا تھا۔ میرے آتے ہی لوگوں میں پہلے تو کھُسر پھُسر ہوئی اور پھر سب مل کر نعرے لگانے لگے ”آ گئے انوشا مہاراج آ گئے!“

مجھے اپنی یہ عزّت افزائی عجیب سی لگ رہی تھی۔ دوسروں کی زبان سے اپنے لیے

مہاراج کا لفظ مُجھے سچ مُچ بڑا عجیب محسوس ہوتا تھا۔ میرے مہاراج تو صرف سارنگ بابا تھے۔ وہی سب کُچھ تھے، میں تو کُچھ بھی نہ تھا" جانتے ہو، اب تمہیں کیا کرنا ہے؟" سارنگ بابا نے مُجھ سے پوچھا۔

"نہیں مہاراج؟" میں نے جواب دیا۔ "جو آپ حکم دیں گے وہی کروں گا۔"

"وہ اپنی زبان تمہیں دے گیا ہے۔" سارنگ بابا بولے۔ "یہ زبان تمہیں اِس سے لینی ہے اور یہی تمہاری دعوت ہے۔"

میں حیران سا ہو کر سارنگ بابا کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بالکل سنجیدہ تھے۔ پھر اُنہوں نے سارا کام مُجھے سمجھایا۔ سارنگ بابا کی ہدایت کے مطابق میں نے پہلے شانی کو آواز دی "شانی! میرے بھائی! آؤ اور اپنے بھائی انوشا کو اپنا فرض پورا کرنے دو۔"

آواز دینے کی دیر تھی کہ شانی لاش سے ہٹ کر چارپائی سے اُترا اور رینگتا ہوا سیدھا میرے قدموں میں آ گیا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر پیار کیا، جسم پر محبّت سے

ہاتھ پھیرا اور پھر اُسے سارنگ بابا کے حوالے کر دیا۔ اِس کے بعد میں چارپائی کی طرف بڑھا۔ سارنگ بابا کا بتایا ہوا منتر پڑھتے ہوئے میں نے چارپائی کے تین چکّر لگائے اور پھر لاش کے اوپر اِس طرح لیٹ گیا کہ میرا مُنہ اُس کے مُنہ کے اُوپر تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کی پیٹھ کے پیچھے لے جا کر اُسے مضبوطی کے ساتھ اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

اس کے بعد میں نے دِل ہی دِل میں سارنگ بابا کا بنایا ہوا منتر پڑھنا شروع کیا اور اس کے ساتھ ہے سارنگ بابا نے بِین پر ایک دُھن بجائی شروع کی۔ یہ مہاتالی کی دُھن تھی۔ خاصی دیر تک میں دِل ہی دِل میں منتر پڑھتا رہا اور سارنگ بابا بِین بجاتے رہے۔ پھر یکایک لاش میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ سیدھی کھڑی ہوئی اور اُس نے اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن میں نے اور بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ لاش کئی کئی گز تک اُوپر اُچھلی اور اُس کے ساتھ میں بھی اُچھلا۔ لیکن میں نے نہ تو اُسے اپنی گرفت سے نکلنے دیا اور نہ اُس کے مُنہ پر سے اپنا مُنہ ہٹایا۔ اس کے ساتھ ہی میں برابر

منتر پڑھتا رہا اس سارنگ بابا بِین بجاتے رہے۔

ایک بار لاش پہلے سے کئی گُنا اُوپر اُچھلی اور اُس کے ساتھ ہی میں بھی فضا میں بُلند ہو گیا۔ لاش کا مُنہ کھُلا اور اُس کی زبان باہر نکل آئی۔ میں نے اُسے فوراً اپنے مُنہ میں لے لیا۔ لاش کی ساری حرکت ایک دم ختم ہو گئی اور وہ جتنی تیزی سے اُوپر اُچھلی تھی، اُتنی ہی تیزی سے نیچے کی طرف آئی، اور ہم دونوں دھم سے آگ کے دہکتے ہوئے الاؤ میں آ گِرے۔

الاؤ میں گِرتے ہی میری گرفت لاش پر سے خود بخود ڈھیلی پڑ گئی۔ لاش کا میری گرفت سے آزاد ہونا تھا کہ وہ کسی سُوکھی لکڑی کی طرح جل اُٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے جل کر راکھ ہو گئی۔

لیکن مُجھے یہ آگ کے الاؤ کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں الاؤ میں نہیں، گھاس کے کسی نرم نرم ڈھیر پر آ گیا ہوں۔ مُجھے نہ تو آگ کی تپش محسوس ہوئی اور نہ آگ نے میرے جسم پر کوئی اثر کیا۔ مَیں گِرتے ہی اُٹھا اور جلتی ہوئی لکڑیوں

پر سے ہوتا ہوا ناہر آ گیا۔

سارنگ بابا نے آگے بڑھ کر مُجھے گلے لگا لیا اور میرا ماتھا چومتے ہوئے بولے۔ ”شاباش بیٹے! تُم نے کمال کر دیا ہے۔“

اب میں نے اِرد گِرد نگاہ کی۔ لوگ حیرت اور خوف کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ آگ کے الاؤ میں سے زندہ سلامت نکلتے دیکھ کر اُن پر جو حیرانی طاری ہوئی تھی، اُس نے اُن کی زبانیں گُنگ کر دی تھیں۔ وہ میری طرف یُوں دیکھ رہے تھے جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہے۔ خود راجا ناگ سین بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

اور پھر یکا یک مُجھے احساس ہوا کہ لاش کی زبان بتاشے کی طرح میرے مُنہ میں گھُل گئی ہے۔ یہ بڑی حیرانی کی بات تھی۔ لیکن سانپ کا مَن دُودھ میں حل کر کے پینے اور آگ کے الاؤ سے زندہ سلامت نکل آنے کے بعد مُجھے اِس پر کوئی تعجّب نہیں ہوا۔ سارنگ بابا نے مُجھے نہ جانے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

پھر جیسے لوگوں کی حیرانی ختم ہو گئی اور انہیں معلوم ہو گیا کہ اُن کی آنکھوں نے جو کُچھ دیکھا ہے، وہ ایک وہم نہیں حقیقت ہے۔ اُنہوں نے زور سے نعرہ لگایا:

"انوشا مہاراج کی جے!"

راجا ناگ سین نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ چومے اور اُس کی دیکھا دیکھی لوگ بھی دیوانوں کی طرح میرے ہاتھ چومنے لگے۔

بانکا مُرلی والا

ہم پورے چالیس دِن راجاناگ سین کے ہاں مہمان رہے۔ اِس دوران میں آگ کے الاؤ کی دعوت کی خبر دُور دُور تک پھیل گئی تھی۔ روزانہ سینکڑوں لوگ آتے اور یوں میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے جیسے میں کوئی بہت ہی پہنچا ہوا بزرگ ہوں۔ خود راجا ناگ سین ہمارے کھانے کے وقت نوکروں کی طرح ہاتھ باندھے ہمارے سامنے کھڑا رہتا تھا۔ اکتالیسویں (۴۱) دِن جب ہم وہاں سے چلے تو وہ اپنے درباریوں سمیت خاصی دُور تک ہمیں چھوڑنے آیا۔

راجاناگ سین سے رُخصت ہو کر ہم کئی روز تک سفر کرتے رہے۔ جس بستی میں

بھی داخل ہوتے، یوں معلوم ہوتا جیسے وہاں کے لوگوں کو ہمارے آنے کی خبر پہلے ہی ہو چکی ہے۔ ہمارا بڑی دھوم دھام سے استقبال ہوتا اور لوگ ہمارے قدموں کو چھونا اپنے لیے فخر اور خوشی کا باعث سمجھتے۔ کئی بستیوں میں ہم نے سانپ کے ڈسے ہوئے لوگوں کا علاج بھی کیا۔

پھر ایک شام ہم ایک ایسی بستی میں پہنچے جہاں ایک لاش ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ یہ لاش ایک ایسے نوجوان کی تھی جو بڑی پیاری بانسری بجاتا تھا اور آس پاس کی بستیوں میں بانکا مُرلی والا کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی عُمر پچیس تیس سال کے درمیان تھی اور اُس کی شادی ابھی پچھلے سال ہی ہوئی تھی۔ اُس کے بارے میں لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ اُس کی بانسری کی آواز سُن کر پنچھی اُڑنا بھول جاتے ہیں اور بہتا پانی رُک جاتا ہے۔

چند روز پہلے وہ نوجوان کسی کام سے دس بارہ کوس دُور ایک بستی میں گیا تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو شام کا جھٹ پٹا ہو رہا تھا اور اُسے جنگل سے گُزر کر اپنی بستی تک آنا تھا۔ اُس نے بانسری ہونٹوں سے لگالی اور اُسے بجاتے ہوئے جنگل سے گزر کر

بستی کی طرف آنے لگا۔ بستی کے قریب آ کر جیسے ہی اُس نے بانسری اپنے ہونٹوں سے الگ کی، قریب ہی شُوں کی سی آواز آئی اور ایک سانپ نے اُسے ڈس لیا۔ وہ چیخ مار کر وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اُس کی چیخ سُن کر لوگ بھاگم بھاگ آئے اور اُسے ایک مکان میں لے گئے۔ لیکن اِس سے پہلے کہ وہ کُچھ کر سکتے، زہر بجلی کی سی تیزی سے اُس کے سارے بدن میں پھیل گیا اور اُس کا بدن سر سے پاؤں تک نیلا پڑ گیا۔

کسی شخص کا سانپ کے کاٹے سے مر جانا بستی والوں کے لیے کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے تھے لیکن یہاں مسئلہ ہی کُچھ اور تھا۔ جب سے اُس نوجوان نے دم توڑا تھا، تب ہی سے ایک سانپ اُس کے جسم سے چمٹا ہوا تھا اور کِسی کو بھی اپنے قریب نہ آنے دیتا تھا۔ اُس نوجوان کو مرے تین روز ہو چکے تھے اور اُس سانپ کی وجہ سے لوگ اب تک اُس کی لاش نہ اٹھا سکے تھے۔

جس مکان میں نوجوان کی لاش پڑی تھی، اُس تک پہنچتے پہنچتے ہمیں یہ سارے حالات معلوم ہو چکے تھے۔ صحن میں ایک چارپائی پر نوجوان کی لاش پڑی تھی

اور اُس پر پڑی ہوئی سفید چادر کے ایک کونے سے سانپ کا چھوٹا سا پھَن صاف نظر آرہا تھا۔

اُسے دیکھتے ہی سارنگ بابا کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اُنہوں نے لوگوں کو دور رہنے کا اشارہ کیا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے:

"انوشا بیٹے! اِسے پہچانو اور شروع ہو جاؤ!" میں نے سانپ کے پھَن کی طرف غور سے دیکھا۔ پہچان لیا کہ یہ کون سا سانپ ہے اور اُس کو مست کرنے کے لیے کون سی دُھن بجانی پڑے گی۔ سارنگ بابا نے ساری دُھنیں سکھاتے وقت ہر دُھن کے متعلّق سانپ کی نشان بتائی تھیں۔ دوسرے پانی کے راجا اور خُشکی کے راجا کی عجیب غریب دعوتوں کے بعد میری حالت کُچھ سے کُچھ ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے سانپ کو دیکھتے ہی بِین ہونٹوں سے لگائی۔ سارنگ بابا کی سِکھائی ہوئی دُھن بجانے لگا۔

بِین کی آواز سُنتے ہی سانپ پہلے تو ذرا چونکا اور پھر جھُومتا ہوا چارپائی سے اُتر کر

زمین پر آ گیا۔ زمین پر آ کر اُس نے کُنڈلی ماری اور جھُوم جھُوم کر اپنا چھوٹا سا خوب صورت پھَن لہرانے لگا۔

پھر اچانک میرے گلے میں جھولتا ہوا شانی نیچے اُترا اور اُس نے جھُومتے ہوئے سانپ کو گردن سے دبوچ لیا اور پھِر اُسے گھسیٹتے ہوئے میرے قدموں میں لے آیا۔ میں نے بِین ہونٹوں سے ہٹا کر غصّے بھری نظروں سے سانپ کی طرف دیکھا اور بولا:

”او کم بخت! کیا اِس نوجوان کو ڈس کر تیرا جی نہیں بھرا تھا کہ اب تُو اُس کی لاش سے آ چمٹا ہے اور اُس کے رشتے داروں کو اسے اٹھانے نہیں دیتا؟“

اِس کے جواب میں سانپ کی ہلکی سی شُوں شُوں کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا: ”مہاراج! میں نے اِسے جان بُوجھ کر نہیں ڈسا۔ میں تو اِس کی بانسری کی آواز سُنتا ہوا اِس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا کہ ایک جگہ وہ ٹھوکر کھا کر گِرا۔ میں اِس کے نیچے آ گیا اور میرا زہر اِس کے جسم میں چلا گیا۔ میں اِس کی بانسری سُننے کے لیے اِس

کے ساتھ چمٹا ہوا ہوں۔ آپ مجھے اِس کی بانسری سُنوا دیجیے۔ میں اِسے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔"

"اسے پکڑے رکھو شانی! اِس کا جھوٹ سچ ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔ یہ کہہ کر میں نوجوان کی لاش طرف بڑھا۔ چادر ہٹا کر اُس کے بدن کو دیکھا جو سر سے پاؤں تک نیلا ہو چُکا تھا۔ پھر میں نے پلٹ کر سانپ سے کہا:

"تو ہم سے جھُوٹ بولتا ہے۔ تو نے اُسے ایک جگہ نہیں، دس جگہ ڈسا ہے۔ فوراً اِس کے جسم سے اپنا زہر نکال لے ورنہ میں شانی کو حکم دوں گا اور وہ تُجھے جلا کر بھسم کر دے گا۔"

سانپ میرا یہ حکم سُن کر لاش کی طرف آنے لگا۔ شانی اسے پکڑے ہوئے تھا۔ جب وہ چارپائی کے قریب آیا تو میرے اشارے پر شانی نے اُسے چھوڑ دیا اور وہ چارپائی پر چڑھ کر لاش کی داہنی پنڈلی پر مُنہ رکھ کر اُس کا زہر چُوسنے لگا۔ اُس کے ساتھ ہی میں نے بِین بجانی شروع کر دی۔ یہ مہاتالی تھی۔

مہاتالی نے یہ عجیب اثر دِکھایا کہ سانپ کا سارا زہر لاش میں سے کھِنچ کھِنچ کر سانپ کے جسم میں واپس پہنچنے لگا۔ جیسے جیسے زہر لاش سے نکلتا گیا، اُس کی نیلاہٹ کم ہوتی گئی اور پھر بالکل ختم ہو گئی۔

سانپ لاش سے سارا زہر واپس چُوس چُکا تو وہ چارپائی سے نیچے اُتر آیا اور مُجھ سے دو قدم کے فاصلے پر کُنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا:

"اب کیا حکم ہے، مہاراج؟ مُجھے اِس کی بانسری سُننے کے لیے کتنا انتظار کرنا پڑے گا؟"

"اِسے تو مرے ہوئے بھی تین دِن ہو چکے ہیں۔" میں نے کہا۔ "تمہیں بانسری کون سُنائے گا، اور کیسے سُنائے گا؟"

"کچھ کیجیے، مہاراج!" سانپ نے درخواست کی۔

ابھی میں کُچھ کہنے نہ پایا تھا کہ سارنگ بابا تیزی سے آگے بڑھے اور کہنے لگے "ارے مورکھ! اب کُچھ نہیں ہو سکتا۔ ہاں، تو خُود بانسری بجانا چاہتا ہو تو دوسری

بات ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں خُود بانسری کیسے بجا سکتا ہوں؟" سانپ نے حیرانی سے کہا۔

سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے بولے۔ "یہ تو بڑی سیدھی سی بات ہے۔ یہ نوجوان مر چُکا ہے، لیکن تو زندہ ہے۔ تو اگر چاہے تو تیری جان اِس کے جسم میں جا سکتی ہے اور اِس طرح تُو خُود بانسری بجا سکے گا۔"

"مجھے منظور ہے، مہاراج۔ مُجھے منظور ہے۔" سانپ نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے۔" سارنگ بابا نے کہا۔ "ابھی اِس کا بندوبست ہوا جاتا ہے۔"

اب ہمارے ارد گرد مشعلیں روشن ہو چکی تھیں اور لوگ خاموشی اور حیرت سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ سانپ کی باتیں صرف ہم دونوں ہی سمجھ سکتے تھے۔ لوگوں کا اُنہیں سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

سارنگ بابا نے اپنے تھیلے میں سے ایک چکنی سی دوا نکالی اور اُسے لاش کے سینے اور پیٹ پر مل دیا۔ پھر وہ سانپ سے کہنے لگے۔

”لو، آؤ اور اِس کے مُنہ پر مُنہ رکھ کر لیٹ جاؤ۔“

سانپ نے فوراً سارنگ بابا کے حکم کی تعمیل کی اور لاش کے مُنہ پر مُنہ رکھ کر لیٹ گیا۔ سارنگ بابا نے شانی کی گردن پکڑ لی اور پھر مُجھ سے بولے:

”انوشا بیٹے! اب شانی والی دُھن بجاؤ۔“

میں نے بِین پر شانی والی دُھن شروع کی۔ یہ وہی سوویں دُھن تھی جو سارنگ بابا نے مُجھے سکھائی تھی۔ میں بِین بجاتا رہا اور شانی سارنگ بابا کے ہاتھ میں بے چینی سے بَل کھاتا رہا۔ جیسے جیسے بِین کی لَے تیز ہوتی گئی شانی کی بے چینی بڑھتی گئی۔

سارنگ بابا نے ایک ہاتھ سے شانی کو گردن سے تھام رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ وہ سانپ کے جسم پر پھیر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سانپ کی جان کو اُس کے جسم سے کھینچ کر اُس کے مُنہ میں جمع کر رہے ہیں تاکہ اُسے نوجوان کے جسم میں

داخل کر سکیں۔ اِس کے ساتھ ہی وہ مُنہ ہی مُنہ میں کوئی منتر بھی پڑھ رہے تھے۔

پھر سارنگ بابا نے شانی کی گردن چھوڑ دی اور اُس کا مُنہ سانپ کی دُم کے قریب کر دیا۔ آگ کا ایک شعلہ سا لپکا اور سانپ کی دُم کسی خُشک لکڑی کی طرح جل اُٹھی۔ اب سارنگ بابا نے سانپ کے مُنہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تا کہ وہ لاش کے مُنہ پر مضبوطی کے ساتھ جمارہے۔ میں بِین بجائے جارہا تھا۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ سانپ کا جلتا جسم کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا اور اُس کے جسم کی آگ سے لاش پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

جب آگ سانپ کے مُنہ تک پہنچی تو سارنگ بابا نے دُھن بند کرنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بِین ہونیوں سے ہٹائی اور غور سے لاش کی طرف دیکھا۔ سارا سانپ جل کر راکھ ہو چُکا تھا اور ایک جلی ہوئی رسّی کی صورت میں نوجوان کی لاش پر پڑا نظر آرہا تھا۔

سارنگ بابا نے سانپ کی راکھ کر بڑی احتیاط سے لاش پر سے سمیٹ کر پوٹلی میں باندھ لیا۔ پھر پانی کی ایک بالٹی منگوائی اور اُسے نوجوان کی لاش پر اُنڈیل دیا۔ پانی کا انڈیلنا تھا کہ نوجوان جھُر جھُری لیتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ نوجوان کو اُٹھتے دیکھ کر اِردگرد کھڑے لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ لیکن یہ چیخیں حیرانی اور خوشی کی تھیں۔ سارنگ بابا نے اُن کے بانکے مُرلی والے کو تین دِن بعد زندہ کر دیا تھا لیکن یہ بات صرف سارنگ بابا اور مُجھے ہی معلوم تھی کہ اب اِس کے جسم میں جو جان ہے وہ اُس کی اپنی نہیں، اُس سانپ کی ہے جس نے اُسے ڈسا تھا۔

کیسر ناگ

اس کے بعد بستی والوں نے ہماری جو خاطر مدارت کی اُسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خوش تھے کہ ان کا بانکا زندہ ہو گیا تھا۔ اُس کی بیوی خوش تھی کہ اُس کا سُہاگ سلامت رہ گیا تھا۔ اُس کی بانسری کا عاشق سانپ خوش تھا کہ اب وہ خود بانکا بن گیا تھا اور خود بانسری بجا سکتا تھا۔

یہ ایک ایسا عجیب و غریب سودا تھا جس میں سب نفع میں رہے تھے۔ بستی والے بھی، بانکا بھی، بانکے گی بیوی بھی اور بانکے کی بانسری کا عاشق سانپ بھی۔ لیکن سارنگ بابا کے کہنے کے مطابق سب سے زیادہ نفع میں ہم تھے کیوں کہ اِس

سانپ کی راکھ کی صورت میں ہمیں ایک انمول خزانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ سارنگ بابا ایک مدّت سے اس کی تلاش میں تھے۔ اِسی لیے اُس سانپ کو دیکھتے ہی اُن کی آنکھیں چمک اُٹھی تھیں۔

بابا اگلی صُبح منہ اندھیرے ہی ہم وہاں سے چل دیے۔ ہماری منزل کیسر ناگ کا جنگل تھی جہاں ناگوں کا ناگ کیسر ناگ رہتا تھا، جو اژدہے کی سواری کرتا تھا اور جس کے بدن سے کیسر یعنی زعفران کی خوش بُو آتی تھی اور یہی خُوش بُو اِس ناگ کا سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ کیوں کہ جو کوئی بھی اِس کے قریب جانے کی کوشش کرتا تھا، اِس تیز خوشبو کی وجہ سے بے ہوش ہو جاتا تھا۔

کئی مہینوں کے سفر کے بعد ہم اس پہاڑی کے دامن میں پہنچے جس کے دوسری طرف کیسر ناگ کا گھنا اور خوف ناک جنگل تھا اور جہاں دِن کے وقت بھی رات کا سا اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ اِس جنگل کے اندر سات چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ چوتھی پہاڑی کے قریب ایک چشمہ تھا جس کا پانی کُچھ دور تک بہنے کے بعد کیسر ناگ کے جنگل کے گھنے درختوں میں غائب ہو جاتا تھا۔ اس چشمے سے ذرا فاصلے پر

وہ پر اسرار اور خوف ناک غار تھا جس میں ناگوں کے ناگ کیسر ناگ کا بسیرا تھا۔ یہ غار پہاڑی کے اندر نہ جانے کتنی دور تک چلا گیا تھا۔

کیسر ناگ ہر مہینے کی چودھویں رات کو اپنے اژدہے پر سوار ہو کر جنگل کی سیر کرنے کے لیے غار سے باہر آتا تھا۔ اِس سیر کے دوران جو بھی جاندار انسان یا حیوان اس کے نزدیک آتا تھا، وہ اُس کی تیز خوشبو سے بے ہوش ہو جاتا تھا اور پھر اژدہے کا لُقمہ بن جاتا تھا۔ ہم سے پہلے نہ جانے کتنے سنیاسی، جوگی اور سپیرے کیسر ناگ کو قابُو میں کرنے کی کوششیں کر چکے تھے اور ناکام رہے تھے۔ اب کیسر ناگ کے جنگل میں جگہ جگہ اُن کی ہڈّیوں کے پنجر بِکھرے پڑے تھے۔ ہڈّیوں کے اُن ڈھانچوں نے کیسر ناگ کے ڈراؤنے پن کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ سارنگ بابا نے یہ تمام باتیں مُجھے سفر کے دوران میں ہی بتا دی تھیں۔

پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ہم شام کے قریب اُس بستی میں پہنچے، رات اُس بستی میں بسر کی اور صُبح ہوتے ہی کیسر ناگ کے جنگل کی طرف چل دیے۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر ہم نے سامنے نگاہ کی۔ جہاں تک نظر کام

کرتی تھی، جنگل ہی جنگل دِکھائی دیتا تھا۔ ہم پہاڑ کی اُترائی اُترے اور پھر جنگل میں داخل ہو گئے۔ جب ہم بستی میں داخل ہوئے تو چاند کی گیارہویں رات تھی۔ اس لحاظ سے اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے ہمارے پاس تین دِن اور دو راتیں تھیں۔ مگر جنگل میں داخل ہونے کے بعد ہمارے لیے دِن اور رات کا فرق مٹ گیا۔ ہم چلتے رہے۔ کہیں رُکے اور نہ کہیں آرام کیا۔ اگرچہ سارنگ بابا وہ مُجھے بتا چُکے تھے، لیکن حقیقت میں یہ جنگل اُس سے کہیں گھنا اور ڈراؤنا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد کوئی نہ کوئی ہڈّیوں کا ڈھانچا ہمارے قدموں سے ٹکراتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کیسر ناگ کے جنگل میں ہڈّیوں کے سینکڑوں نہیں، ہزاروں ڈھانچے بکھرے پڑے ہیں۔

جنگل سے گُزر کر ہم پہلی پہاڑی پر پہنچے۔ اس کے آگے پھر جنگل تھا۔ پھر دوسری پہاڑی آئی۔ پھر تیسری۔ اور جب ہم چوتھی پہاڑی کے قریب پہنچے تو تیرہویں رات کا چاند اپنا سفر ختم کر چکا تھا۔

اس پہاڑی کے پاس پہنچ کر ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہم کیسر ناگ کے گھنے اور

خوف ناک جنگل میں مسلسل دو دِن اور دو راتیں سفر کرتے رہے تھے اور اب اپنی منزل پر آ پہنچے تھے۔ صُبح ہونے والی تھی۔ ہمارے پاس آرام، انتظار اور تیّاری کے لیے پورادِن پڑا تھا۔

سامنے کُچھ دور وہ چشمہ دِکھائی دے رہا تھا، جس کا پانی کُچھ دور بہنے کے بعد کیسر ناگ کے جنگل کے گھنے درختوں میں غائب ہو جاتا تھا۔ ہم سیدھے اُس چشمے کی طرف بڑھے۔ چشمے کے پاس پہنچتے ہی سارنگ بابا نے میرے گلے میں جھُولتے ہوئے شانی کے ہاتھ میں لیا اور اسے مخاطب کر کے بولے:

"شانی بیٹے، تُم اس چشمے میں رہو گے اور جب تک میں نہ بُلاؤں، باہر نہیں آؤ گے سمجھ گئے نا؟"

شانی نے اپنا پھن ہلایا اور پھر غڑاپ سے چشمے کے پانی میں غوطہ مار گیا۔ پھر سارنگ بابا مُجھ سے کہنے لگے:

"لو، ذرا اس چشمے کا پانی پی کر دیکھو۔ پانی کیا ہے۔ امرت ہے امرت!"

میں نے جھک کر اوک سے پانی پیا۔ ذائقے اور مٹھاس میں وہ بالکل دُودھ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ میں اوپر تلے کئی چُلّو پی گیا۔

سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے بولے۔ "واہ! تُم تو اِس پانی پر ہی ریجھ گئے!"

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور مُنہ پونچھتے ہوئے سامنے دیکھنے لگا۔ اس چشمے سے کوئی پچاس قدم کے فاصلے پر اس غار کا دہانہ نظر آرہا تھا جس کے اندر کیسر ناگ کا بسیرا تھا۔ جہاں سے وہ ہر مہینے پورے چاند کی رات کو اپنے اژدہے پر سوار ہو کر جنگل کی سیر کے لیے نکلتا تھا۔

ہم چشمے سے ہٹ کر درختوں کے ایک جھُنڈ میں آ گئے۔ سارنگ بابا نے کہا۔ "انوشا بیٹے، اب تم شام تک آرام کر سکتے ہو۔ چاند نکلنے کے ایک پہر بعد ہمارا کام شروع ہو گا۔ کام ہے تو بڑا خطرناک، لیکن گھبرانا نہیں؟"

میں جواب میں کُچھ کہنے کے بجائے مُسکرانے لگا۔ کام کیسا ہی خطرناک سہی، سارنگ بابا کے ہوتے ہوئے مُجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ مُجھے اطمینان تھا کہ سارنگ بابا

جان بُوجھ کر مُجھے موت کے مُنہ میں نہیں دھکیلیں گے۔ یہ بات وہ بہت پہلے کہہ چکے تھے اور اُنہیں اِس کے دہرانے کی ضرورت نہ تھی۔ ویسے بھی وہ مُجھے ایک ایسے مقام پر لے آئے تھے جہاں ہر خطرہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ میں وہیں زمین پر لیٹ گیا اور جلد ہی نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔

شام تک بڑے مزے کی نیند سوتا رہا۔ جب سارنگ بابا نے مُجھے جگایا تو آسمان پر چودھویں رات کا چاند جگمگا رہا تھا۔ نیند سے بیدار ہوتے ہی ایک عجیب سی بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ یہ بُو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

"کیسر ناگ اپنے غار سے باہر آ چکا ہے، انوشا بیٹے!" سارنگ بابا نے مُجھے بتایا۔ "یہ بُو جو تُم سونگھ رہے ہو، اُسی کی ہے۔ کیسر ناگ کی بُو سے سارا جنگل مہک اُٹھتا ہے لیکن جو جان دار اُس کے آس پاس ہو، وہ بے ہوش ہو جاتا ہے۔ ذرا اپنے آپ کو سنبھال کر بیٹھ جاؤ۔ کیسر ناگ جب واپس آئے گا تو اس چشمے کے پاس سے ہو کر غار میں واپس جائے گا۔ ہم چشمے اور غار کے درمیان اُس کے سامنے آ کر اپنا کام کریں گے۔"

اس کے بعد سارنگ بابا نے تفصیل کے ساتھ سارا کام مُجھے سمجھایا۔ بانکے کی بانسری کے عاشق سانپ کی راکھ کی جو پوٹلی اُن کے پاس تھی، اُس کے دو حصّے کیے۔ آدمی راکھ اُنہوں نے خود رکھ لی اور آدھی مُجھے تھما دی۔ اس کے بعد ہم چوکس ہو کر بیٹھ گئے اور کیسر ناگ کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔

کافی وقت گزر گیا۔ اس کے بعد اچانک ایک خوفناک گونج کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی تیز خوش بُو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ گونج ایسی خوف ناک تھی کہ مُجھے پھر جھُرجھُری سی آ گئی اور خوش بُو ایسی تیز تھی کہ مُجھے اپنے ہوش و حواس رُخصت ہوتے معلوم ہوئے۔ اس خوف ناک گونج اور خوش بُو کا مطلب صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ کیسر ناگ سیر ختم کر کے واپس آ رہا ہے اور اب ہمارے قریب سے گُزرا ہی چاہتا ہے۔ سارنگ بابا نے اِس کا بندوبست پہلے سے کر رکھا تھا۔ گونج کی آواز آتے ہی اُنہوں نے اپنے تھیلے سے وہ دوا نکالی جو دریا کے کنارے والے چودہ ہاتھ لمبے اژدہے کی راکھ سے تیّار کی گئی تھی۔ انہوں نے کُچھ دوا اپنی ناک میں چھڑکی اور کُچھ میری ناک میں چھڑک دی۔ دوا چھڑکنے کی دیر

تھی کہ خوش بُو کا احساس ایک دم ختم ہو گیا۔ اب مُجھے کسی چیز کی ذرا سی بُو بھی نہیں آ رہی تھی۔

پھر کُچھ دیر بعد چشمے کے قریب ایک بہت بڑا اژدہا نمودار ہوا، جو آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ میں تو اس چودہ ہاتھ لمبے اژدھے کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا، لیکن یہ اژدھا تو کئی چودہ ہاتھ لمبا معلوم ہوتا تھا اور پھر اُس کا مُنہ اتنا بڑا تھا جیسے کسی غار کا دہانہ۔ وہ ایک سالم آدمی کو نِگل سکتا تھا۔

لیکن یہ اژدھا کیسر ناگ نہیں، اُس کی سواری تھا۔ کیسر ناگ تو اُس کے سر پر بیٹھا ہوا تھا۔ چھوٹا سا سانپ تھا، لیکن اُس کی آنکھوں سے شُعلے نکلتے محسوس ہوتے تھے۔ آنکھیں تیزی کے ساتھ چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔

جب کیسر ناگ چشمے کے پاس سے گُزر کر غار کی طرف بڑھا تو سارنگ بابا نے میرا بازو تھام لیا اور بولے:

”آؤ بیٹے! ہمارے کام کا وقت آ پہنچا ہے۔“ ہم تیزی سے درختوں کے جھُنڈ سے نکلے اور غار کے دروازے سے کوئی پندرہ قدم اُدھر جا کھڑے ہوئے۔ سارنگ بابا عین غار کے دروازے کی سیدھ میں اور میں اُن سے چند قدم ہٹ کر دائیں طرف۔ کیسر ناگ اپنے اژدہے پر سوار سیدھا سارنگ بابا کی طرف آ رہا تھا۔

سارنگ بابا کو اپنے سامنے دیکھ کر ناگ شاید حیران رہ گیا۔ اُس کی تیز خوش بُو تو ہر جان دار کو مست اور بے ہوش کر دیتی تھی اور یہاں ایک انسان اُس کے سامنے اپنے ہوش و حواس میں کھڑا تھا! غصّے کی حالت میں وہ اژدہے کے سر سے اُچھل کر سارنگ بابا کی پیشانی سے جا ٹکرایا۔ اس کے مُنہ سے ایک شعلہ سا نکلا اور سارنگ بابا زمین پر گِر کر تڑپنے لگے۔ کیسر ناگ جتنی تیزی سے آیا تھا، اُتنی ہی تیزی سے واپس اپنے اژدہے کے سر پر پہنچ گیا۔

میں فوراً آگے بڑھا اور سارنگ بابا کا مُنہ کھول کر اُس دوا میں سے، جو اُنھوں نے مجھے دی تھی، تھوڑی سی دوا اُن کے حلق میں ڈال دی اور واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔

چند ہی لمحے گُزرے ہوں گے کہ سارنگ بابا بھلے چنگے ہو کر پھر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنہوں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں مُجھے شاباش دی اور پھر کیسر ناگ کے عین سامنے آ گئے۔

بجلی کی سی تیزی سے کیسر ناگ پھر اُن پر جھپٹا اور اُن کی پیشانی پر ڈس کر واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ سارنگ بابا پھر زمین پر ِگر کر تڑپنے لگے میں نے پھر آگے بڑھ کر دوا اُن کے حلق میں ڈال دی اور واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔

ذرا دیر بعد سارنگ بابا پھر اُٹھ کھڑے ہوئے اور پھر کیسر ناگ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ کیسر ناگ نے جھُنجھلا کر ایک خوفناک پھُنکار ماری، اپنی جگہ سے اُچھلا اور سارنگ بابا کی پیشانی سے جا ٹکرایا۔ ایک شعلہ سا لپکا۔ پھر کیسر ناگ تیزی کے ساتھ واپس اپنی جگہ پر آ گیا اور سارنگ بابا لڑکھڑا کر زمین پر ِگر گئے۔ میں نے فوراً آگے بڑھ کر دوا اُن کے حلق میں ڈال دی۔ ذرا دیر بعد وہ اُٹھ کھڑے ہو اور پھر کیسر ناگ کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔

کیسر ناگ نے ایک بار پھر جھُنجھلا کر اُن پر حملہ کیا۔ وہ اپنی جگہ سے اُچھلا اور سارنگ بابا کی پیشانی پر ڈس کر اپنی واپس پہنچ گیا۔ سارنگ بابا لڑکھڑائے لیکن زمین پر ِگرے نہیں۔ میں اُن کی طرف بڑھا تو اُنہوں نے باقی بچی ہوئی ساری دوا خود ہی میرے ہاتھ سے لے کر پھانک لی، اور میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولے:

”شاباش بیٹے! اب تمہاری باری ہے لیکن گھبرانا نہیں۔ اس کا آدھے سے زیادہ زہر تو میں نے ختم کر دیا ہے۔ شاباش! اب چلو، آجاؤ میدان میں۔“

یہ کہتے ہی وہ ایک طرف ہٹ گئے اور میں کیسر ناگ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اُس کے بعد یکے بعد دیگرے چار بار میرے ساتھ بھی وہی کُچھ ہوا جو سارنگ بابا کے ساتھ ہوا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ سارنگ بابا کی نسبت مُجھ پر ناگ کے ہر وار کا اثر زیادہ دیر تک قائم رہا۔ سارنگ بابا تو کیسر ناگ کے چوتھے وار سے زمین پر نہیں ِگرے تھے اور خود ہی دوا میرے ہاتھ سے لے کر پھانک لی تھی۔ لیکن میں کیسر ناگ کے چوتھے وار سے بھی خاصی دیر تک بے ہوش رہا تھا۔

کیسر ناگ کے چوتھے وار کے بعد جب مُجھے دوبارہ ہوش آیا تو سارنگ بابا نے مُجھے تھپکی دی اور بولے۔ ”شاباش بیٹے! اب ذرا بِین سنبھالو۔“

یہ کہہ کر وہ کیسر ناگ کے سامنے سے ہٹ کر اژدھے کی دُم کی طرف جا کھڑے ہوئے۔ اُس کے ساتھ ہی اُنہوں نے شانی کو آواز دی۔ شانی تو صُبح سے ہی جیسے چشمے کے اندر اُن کی آواز کا منتظر تھا۔ آواز سُنتے ہی وہ ایک دم پانی سے نکلا اور رینگتا ہوا سارنگ بابا کی طرف آیا۔ سارنگ نے اُس کی گردن پکڑ لی اور پھر مُجھے اشارہ کیا۔ میں نے بِین بجانی شروع کی۔ یہ وہی شانی والی دُھن تھی۔

بِین کی آواز سُن کر کیسر ناگ غصّے بھری آنکھوں سے میری طرف گھورتا رہا، لیکن اب اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر مُجھ پر حملہ کر سکتا۔ ایک نہ دو، پورے آٹھ حملوں نے اُس کا سارا زہر ضائع کر دیا تھا اور اُس کی ساری طاقت جاتی رہی تھی۔ میں بِین بجاتا اور وہ غصّے اور بے بسی سے میری طرف دیکھتا رہا۔

جیسے جیسے بِین کی لَے تیز ہوتی گئی، ویسے ویسے شانی کی بے چینی بڑھتی گئی۔ پھر سارنگ بابا نے شانی کی گردن چھوڑتے ہوئے اُس کا مُنہ اژدہے کی دُم کے قریب کر دیا۔ آگ کا ایک شعلہ سا لپکا اور اژدہے کی دُم کسی خُشک لکڑی کی طرح جلنے لگی۔

اژدہے کی دُم میں آگ لگی تو وہ ایک خوف ناک پھُنکار کے ساتھ تیزی سے بل کھاتے ہوئے مُڑا اور اپنے بھاری بھر کم جسم کے ساتھ چشمے کی طرف بڑھا۔ آگ کی تپش سے اُس کا سر زور سے ہلا۔ سر ہلنے کی وجہ سے کیسر ناگ زمین پر گِر پڑا اور وہ اژدہا جو نہ جانے کب سے اپنے آقا کیسر ناگ کو ہر مہینے پورے چاند کی رات کو جنگل کی سیر کراتا تھا، اب اُسے زمین پر پٹک کر خود چشمے میں کُود گیا لیکن اُس کے جسم میں جو آگ لگی تھی، وہ شانی کی لگائی ہوئی تھی وہ ایسی نہ تھی جو پانی سے بُجھ سکتی۔

اژدہے کے چشمے میں کودتے ہی وہی کُچھ ہوا جو سردار کی بیوی کی تندرستی والے جشن کے موقع پر اُس شخص کے ساتھ ہوا تھا جس کے جسم میں شانی کی پھُنکار نے

آگ لگا دی تھی اور وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے جوہڑ میں کُود گیا تھا۔ جس طرح اُس شخص کے کُودتے ہی جوہڑ ایک دہکتا ہوا الاؤ بن گیا تھا، اِسی طرح اژدہے کے چشمے میں کُودتے ہی چشمے میں آگ لگ گئی تھی۔

لیکن ہمیں پانی میں آگ کا یہ تماشا دیکھنے کی فُرصت نہ تھی۔ جیسے ہی اژدہا کیسر ناگ کو زمین پر پٹک کر چشمے کی طرف لپکا، سارنگ بابا نے آگے بڑھ کر کیسر ناگ کو دبوچ لیا۔ اُنہوں نے اُس کے درمیان سے کھینچ کر دو ٹکڑے کر دیے۔ ایک ٹکڑا وہ خود کچر کچر کھا گئے اور دوسرا ٹکڑا میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ ”لو انوشا بیٹے، جلدی سے کھا جاؤ۔“ سارنگ بابا کے یہ الفاظ سُن کر میں حیران رہ گیا اور ڈر کے مارے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا:

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا جی! میں اِس سانپ کو کھاؤں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”مورکھ نہ بنو، بیٹے۔ کھا جاؤ اِسے۔ جلدی سے کھا جاؤ۔“

”نہیں بابا جی، یہ مُجھ سے نہیں ہو سکتا۔“ میں نے کراہت سے کہا۔

”یہ تمہارے بھلے کی بات ہے، انوشا بیٹے۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”کھاؤ گے تو تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔“

لیکن میرا دِل سانپ کھانے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ میری ہچکچاہٹ دیکھ کر سارنگ بابا نے آگے بڑھ کر مُجھے دبوچ لیا۔ ایک ہاتھ سے میرا مُنہ کھولا اور دوسرے ہاتھ سے کیسر ناگ کے جسم کا آدھا حصّہ زبردستی میرے حلق میں ٹھونس دیا۔ مُجھے یُوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم میں آگ سی لگ گئی ہے۔ اِس کے ساتھ ہی میرا جی متلانے لگا۔ سامنے، چند قدم کے فاصلے پر، وہ چشمہ تھا جس میں اژدھا کُود گیا تھا۔ اب اِس میں اژدہا تھا اور نہ پانی۔ چشمے کا سارا پانی بھاپ بن کر اُڑ گیا تھا اور اژدہے کا کہیں پتا نہ تھا۔ چشمہ خُشک ہو کر ایک گہرے کھڈ کی طرح نظر آ رہا تھا۔

میرے جسم میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ ایسا موقع اِس سے پہلے میری زندگی میں کبھی نہیں آیا تھا۔ مُجھے سر گھُومتا ہوا محسوس ہوا اور پھر مُجھے اپنے آپ کی کوئی سُدھ بُدھ نہ رہی۔

سفید ہیرے، سُرخ ہیرے

جب مُجھے ہوش آیا تو میں نے آنکھیں کھول کر اپنے اِرد گرد دیکھا۔ چاروں طرف دِن کا اُجالا پھیلا ہوا تھا اور میں کیسر ناگ کے جنگل میں نہیں، کسی میدان میں پڑا تھا۔ یہ میدان مُجھے جانا پہچانا سا لگا۔ دماغ پر زور دیا تو فوراً یاد آ گیا کہ یہ تو وہی میدان ہے جہاں سردار کی بیوی کے تندرست ہونے کی خوشی میں کھیل تماشوں کا اہتمام کیا گیا تھا اور جہاں شانی ہمارے ہاتھ آیا تھا۔ اسی میدان کے ایک کونے میں مٹّی کا وہ ٹیلا بھی نظر آ رہا تھا جہاں کبھی جوہڑ ہوتا تھا اور جس میں شانی کا پہلا مالک شانی کی پھُنکار سے جسم میں آگ لگ جانے کے بعد کُودا تھا۔ سارنگ بابا کی ہدایت پر بستی کے سردار نے اُس مٹّی کے ٹیلے کے گرد جو باڑ لگوائی تھی، وہ قائم

تھی۔

"کہو، انوشا بیٹے! اب کیسے ہو؟" سارنگ بابا کی آواز میرے کان میں آئی۔ میں چونک اُٹھا۔ سارنگ بابا مُجھ پر جھُکے ہوئے تھے۔ اُن کی آنکھیں مُسکرا رہی تھیں، جیسے وہ سب کُچھ جانتے ہیں۔ سب کُچھ سمجھتے ہیں۔

"بابا جی! ہم کہاں ہیں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"تم پہچانے نہیں اِس جگہ کو؟"

"پہچان تو گیا ہوں، مہاراج" میں نے جواب دیا۔

"یہ وہی میدان ہے جہاں کھیل تماشے دِکھائے گئے تھے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم یہاں کیسے پہنچ گئے، کیسر ناگ کے جنگل سے؟"

سارنگ بابا کہنے لگے۔ "کیا تمہیں یاد نہیں رہا کہ میں نے تمہیں کیسر ناگ کا آدھا حِصّہ کھلایا ہے۔ یہ اُسی کا اثر ہے کہ تُم پل بھر میں وہاں سے یہاں پہنچ گئے۔ میں تو

تمہیں کیسر ناگ کے جنگل سے سیدھا تکشک ناگ کے مندر میں تمہاری خالہ کے پاس لے جاتا لیکن ہم نے یہاں جنگل میں برگد کے درخت کی جڑوں میں، جو سانپ ہنڈیا میں بند کر کے دبایا تھا، اُسے نکالنا ہے۔ اس لیے یہاں آنا پڑا۔"

"مُجھے یاد ہے، بابا جی۔ اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے کہا۔

"تو اُٹھو اور وہ ہنڈیا نکال لاؤ۔" سارنگ بابا بولے۔ "میں اور شانی تمہارا انتظار کریں گے۔"

"بہت اچھا۔" میں نے کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے اِرد گرد ایک نظر ڈالی اور پھِر جنگل کی طرف چل دیا۔ مُجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں چل نہیں رہا، بلکہ زمین میرے قدموں تلے سے سَرک سَرک کر مُجھے آگے بڑھائے جا رہی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے میں اُڑ رہا ہوں۔ یقیناً یہ اُسی کیسر ناگ کا اثر تھا جو سارنگ بابا نے زبردستی مُجھے کھلایا تھا۔

ذرا سی دیر میں، مَیں جنگل میں برگد کے اُس درخت کے پاس جا پہنچا جس کی

جڑوں میں ہم نے وہ ہنڈیا دبائی تھی۔ اچانک مُجھے خیال آیا کہ میں مٹّی کھودنے کے لیے کوئی کھُرپا یا کُدال تو ساتھ لایا ہی نہیں۔ ہنڈیا کیسے باہر نکالوں گا؟ اتنے عرصے میں تو مٹّی کی اوپر کی تہہ سخت ہو گئی ہو گی۔ لیکن جب میں نے اس جگہ کو ہاتھ لگایا تو میرا ہاتھ لگتے ہی وہاں ایک بڑی سی دراڑ پڑ گئی۔ شاید یہ بھی اُسی کیسر ناگ کا اثر تھا جسے سارنگ بابا نے مُجھے کھلایا تھا۔

میں نے ہنڈیا نکالی اور جس تیزی سے آیا تھا، اُسی تیزی سے واپس سارنگ بابا کے پاس جا پہنچا۔ میں نے ہنڈیا اُنھیں تھما دی اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ کس طرح میرا ہاتھ لگتے ہی مٹّی نے مُجھے راستہ دے دیا تھا۔

سارنگ بابا مُسکرا دیے۔ شاید وہ جانتے تھے کہ ایسا ہی ہو گا۔ اور شاید اسی لیے اُنہوں نے مُجھے اکیلے وہ ہنڈیا لانے کے لیے بھیجا تھا۔ سارنگ بابا نے ہنڈیا اپنے تھیلے میں ڈال لی اور پھر مٹّی کے ٹیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے:

”یہ ٹیلا یاد ہے نا کہ کیسے اور کیوں بنایا گیا تھا؟“

”بڑی اچھی طرح یاد ہے، بابا جی۔“ میں نے کہا۔ ”یہیں تو وہ جوہڑ تھا جس میں اس جلتے ہوئے شخص نے چھلانگ لگائی تھی۔“

”ہاں، انوشا بیٹے۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”تمہیں یہ بھی یاد ہو گا کہ جوہڑ کا پانی بھاپ بن کر اُڑ گیا تھا اور اس شخص کا جسم کیچڑ میں مل کر پتھّر کی سِل کی طرح سخت ہو گیا تھا۔“

”مُجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو یوں کرو انوشا بیٹے، اس مٹّی کو ہٹاؤ اور دیکھو اِس کے نیچے سے تمہیں کیا ملتا ہے۔“

میں مٹّی کے ٹیلے کی طرف بڑھا۔ ہاتھ لگاتے ہی باڑ ایک طرف جا گری اور میں آگے بڑھ کر مٹّی ہٹانے لگا۔ برگد والے گڑھے کی طرح یہاں بھی مٹّی میرا ہاتھ لگنے کے ساتھ ہی ہٹتی جا رہی تھی۔ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ جوہڑ کی وہ تہہ نظر آنے لگی جو پتھّر کی سِل کی طرح سخت ہو گئی تھی۔ جب میری نگاہیں اس پر پڑیں

تو میں حیران رہ گیا۔ وہاں کتنے ہی سُرخ اور سفید ہیرے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔

”باباجی! باباجی!“ میں پکارا۔ ”یہاں تو ہیرے ہیں، سفید اور سُرخ ہیرے!“

”سب نکال لاؤ، بیٹے۔“ سارنگ بابا نے کہا۔

میں اس پتھّر کی سِل کی طرح سخت تہہ کو توڑ توڑ کر ہیرے نکالنے لگا۔ یہ سخت تہہ بھی میرے ہاتھوں میں نرم مٹّی کے ڈھیلوں کی طرح ٹوٹتی جا رہی تھی۔ جلد ہی میں سفید اور سُرخ ہیروں سے دامن بھر کر باہر نکل آیا۔

”شاباش بیٹے!“ سارنگ بابا نے کہا۔ ”تمہیں کُچھ کُچھ اندازہ تو ہو ہی گیا ہو گا کہ تُم کیا سے کیا بن گئے ہو۔ جلد ہی تمہیں اپنی باقی طاقتوں کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔ جانتے ہو ایسا کِس وجہ سے ہوا؟ صرف اِس وجہ سے کہ تم پر شیش ناگ اور تکشک ناگ دونوں کا سایہ ہے۔ اب تُم یہ ہیرے اُن کی نذر کرو گے۔ سفید ہیرے تکشک ناگ کے مندر میں اور سُرخ ہیرے شیش ناگ کے مندر میں جائیں

گے۔"

یہ سن کر میرا دھیان فوراً اُس اژدہے کی طرف گیا جو اپنی دُم میں آگ لگنے کے بعد، کیسر ناگ کو زمین پر پٹک کر، چشمے میں کُود گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"بابا جی! تو کیا اِس چشمے کی تہہ سے بھی ہیرے ملیں گے؟ وہاں بھی تو اژدہا کیسر ناگ کو زمین پر پٹک کر چشمے میں کُود گیا تھا۔"

سارنگ بابا مُسکرا کر بولے۔ "تُم ٹھیک سمجھے ہو، انوشا بیٹے۔ جیسے یہاں ہیرے بنے ہیں، ویسے ہی اُس چشمے میں بھی ہیرے بنیں گے، اور اِن سے زیادہ بنیں گے۔ لیکن وہ کسی اور کی امانت ہیں۔ کس کی؟ یہ وقت آنے پر تُم خُود جان لو گے۔"

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ بستی کا سردار اپنے چند آدمیوں کے ساتھ آتا دِکھائی دیا۔ سارنگ بابا کو پہچان کے وہ ایک دم آگے بڑھا اور اُن کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

”مہاراج! کیا میں آپ کی خدمت کے قابل نہیں رہا جو میں آپ کو اپنے گھر کے بجائے اِس میدان میں دیکھ رہا ہوں، یا مُجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہے؟“

سارنگ بابا نے جواب دیا۔ ”تم غَلَط سمجھے ہو میرے دوست۔ ہم ناراض نہیں ہیں۔ ہمیں یہاں آئے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے۔ مجھے اور خاص طور پر انوشا بیٹے کو یہاں کُچھ کام تھا، جس سے ہم ابھی ابھی فارغ ہوئے ہیں۔ اب ہمارا ارادہ تمہاری طرف جانے کا ہی تھا۔ اچھّا ہوا تم آ گئے۔ چلو، ہم تمہارے گھر چلتے ہیں۔“

ہم سردار کے ساتھ بستی میں پہنچے۔ اُس نے ہمیں اُسی الگ تھلگ مکان میں ٹھہرایا جس میں ہم اِس سے پہلے ٹھہرے تھے۔ جلد ہی ہمارے لیے نہایت عمدہ کھانا اور شانی کے لیے دُودھ سے بھری ہوئی بالٹی آ گئی۔ ہم نے تو کھانا تھوڑا سا ہی کھایا لیکن شانی نے پوری کی پوری بالٹی خالی کر دی۔ بڑی دیر بعد اُسے ایسا عمدہ اور تازہ دُودھ پینے کو ملا تھا۔

شام سے ذرا پہلے سردار کی بیوی سارنگ بابا کے سلام کے لیے آئی۔ اُس کی

گود میں ایک گول مٹول سا بچّہ ہُمک رہا تھا۔ میں پہلی نظر میں اُسے پہچان ہی نہ سکا کہ یہ وہی عورت ہے جس کے پیٹ سے ہم نے سانپ نکالا تھا۔ اُس وقت تو وہ ہڈّیوں کا ڈھانچا تھی لیکن اب ایسی خوب صورت نظر آ رہی تھی کہ چودھویں کا چاند بھی دیکھے تو شرما کر رہ جائے۔ سارنگ بابا نے اُس کے اور اُس کے بچّے دونوں کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرا اور پھر اُسے دُعائیں دے کر رُخصت کیا۔
اس عورت کے جانے کے بعد سارنگ بابا بڑی دیر تک اس کے متعلّق باتیں کرتے رہے، وہ سردار کی چہیتی بیوی تھی اور اُس کی بڑی بہن بھوگ متی کے راجا ناگ سین کے محل میں تھی۔ بہت سے راجا اور راج کمار اُس کے ساتھ شادی کرنے کی آرزو رکھتے تھے لیکن سردار نے تیر اندازی کے مُقابلے میں سب کو ہرا کر اُس کو جیت لیا تھا۔ سردار کی اِس جیت نے اُس کے بہت سے دُشمن پیدا کر دیے تھے اور جب سے وہ اِس عورت کو بیوی بنا کر اپنے گھر لایا تھا تب سے اب تک کئی بار اُس کے دُشمن اپنی ہار کا بدلہ لینے کے لیے اُس کی بستی پر حملہ کرنے کی کوشش کر چکے تھے لیکن، اپنی ہمّت اور حوصلے کی بدولت اُن سب کے دانت کھٹّے

کرتا آیا تھا۔

لیکن اس رات نہ جانے کیسے دُشمنوں کو وار کرنے کا موقع مل گیا۔ سردار کی بیوی صُبح کو سو کر اُٹھی تو اُس کے پہلو سے اُس کا بچّہ غائب تھا۔ ساری بستی میں کہرام مچ گیا۔ سردار اور اُس کی بیوی روتے پیٹتے آئے اور سارنگ بابا کے قدموں میں گر پڑے۔

"کُچھ کیجیے، مہاراج! نہ جانے کون دُشمن میرا بچّہ اُٹھا لے گیا ہے۔ میری مدد کیجئے مہاراج! میرا بچّہ مُجھے واپس نہ ملا تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔" سردار کہہ رہا تھا۔

سارنگ بابا نے بڑے سکون سے کہا۔ "حوصلہ رکھو، میرے دوست تمہارا بچّہ کہیں نہیں جا سکتا۔" اُس کے بعد وُہ مُجھ سے مخاطب ہوئے۔ "انوشا بیٹے، ذرا دیکھو تو سہی ہمارے دوست کا بچّہ کہاں ہے؟"

سارنگ بابا کے اِن الفاظ کے ساتھ ہی مُجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہوں۔ میں نے اِرد گرد نظر ڈالی۔ نیچے وادی میں دو مرد اور ایک

عورت چوروں کی طرح، اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے، ایک پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ عورت نے کسی بچّے کو اُٹھا رکھا تھا۔ بچّہ رو رہا تھا اور عورت کی کوششوں کے باوجود چُپ نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے وہیں سے ایک چھلانگ لگائی اور سامنے پہنچ کر اُن کا راستہ روک لیا۔

"ٹھہرو!" میں نے گرج کر کہا۔ مجُھے اچانک یوں اپنے سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گئے۔ میں نے کڑک کر کہا:

"کون ہو تم لوگ، اور یہ بچّہ کہاں سے اُٹھا کے لائے ہو؟"

پہلے تو وہ گھبرا سے گئے لیکن جب اُنہوں نے دیکھا کہ اُن کے سامنے تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا کھڑا ہے تو وہ سنبھل گئے اور اُن میں سے ایک شخص کہنے لگا:

"تُو کون ہوتا ہے یہ پوچھنے والا؟ جا، نہیں تو تیری ماں تُجھے روتی پھِرے گی۔"

یہ سُن کر تاؤ آ گیا۔ میں نے کہا۔ "تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ سیدھی اُنگلیوں سے

گھی نہیں نکلے گا۔ میری ماں تو مُدّت ہوئی مُجھ کو رو چُکی ہے۔ اب تم اپنی ماؤں کو رو رو کر یاد کرو۔"

یہ کہہ کر میں نے پھونک مارتے ہوئے اُن کے گرد چکّر لگایا تو اُن کے چاروں طرف آگ کا ایک حلقہ بن گیا۔ میں نے کہا:

"میں جانتا ہوں کہ تُم یہ بچّہ کہاں سے اُٹھا کر لائے ہو۔ جب تک تُم واپس جا کر اِسے سردار کے حوالے نہیں کر دیتے، اُس وقت تک تُم اِس آگ کے حلقے سے نہیں نکل سکتے۔"

اُن کا نشہ ہرن ہو گیا۔ وہ جان گئے کہ اُن کے سامنے جو شخص کھڑا ہے، وہ دیکھنے میں تیرہ چودہ سال کا لڑکا سہی، لیکن اُس کے آگے اُن کی ایک نہیں چلے گی۔ عورت بری طرح چیخنے چلّانے لگی اور دونوں مرد بھی ایک دم منّت سماجت پر اُتر آئے: "ہماری خطا بخش دیجیے، مہاراج! ہم سے بھُول ہو گئی۔ ہم ابھی آپ کے ساتھ واپس چلتے ہیں۔ ہم کُچھ لوگوں کے بہکائے میں آکر یہ حرکت کر بیٹھے۔ اب

اِس خطا کی معافی چاہتے ہیں۔"

میں نے اُن کی منّت سماجت کو نظر انداز کرتے ہوئے آگ سے کہا۔ "اے آگ! انہیں واپس سردار کے پاس لے چل!"

یہ کہنے کی دیر تھی کہ آگ کے حلقے میں حرکت ہوئی اور اُس نے اُن لوگوں کو واپس اُس طرف ہانکنا شروع کر دیا جس طرف سے وہ آئے تھے۔ میں اُن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دیر تک اِسی طرح چلتے رہنے کے بعد ہم بستی میں داخل ہوئے اور اُس مکان کے دروازے پر پہنچے جہاں سردار نے ہمیں ٹھہرایا تھا۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی مُجھے سارنگ بابا کی آواز سُنائی دی:

"لو میرے دوست! تمہارا بچّہ واپس آگیا ہے۔"

سارنگ بابا کے اِن الفاظ کے ساتھ میں یُوں چونکا جیسے کسی گہرے خواب سے جاگا ہوں۔ میں نے حیرت سے اپنے اِرد گرد دیکھا۔ میں بدستور سارنگ بابا کے پاس بیٹھا تھا اور سردار اور اُس کی بیوی اُن کے قدموں میں پڑے تھے اور دروازے

میں وہ دونوں مرد اور عورت کھڑے تھے جنہیں میں نے اُس پہاڑ کی چوٹی سے وادی میں دیکھا تھا اور جنہیں میں آگ کے حلقے میں جکڑ کر واپس سردار کے پاس لے آیا تھا۔

بچّے کو دیکھتے ہی سردار کی بیوی آگے بڑھی۔ اُس نے اُسے عورت کی گود سے جھپٹ لیا اور پھر بے تحاشا اُس کا مُنہ چُومنے لگی۔ وہ دونوں مرد اور عورت سردار کے قدموں میں گِر کر گِڑگِڑانے لگے۔

"ہماری خطا بخش دیجیے سردار! ہم آپ کے دُشمنوں کے بہکاوے میں آ گئے تھے۔ ہمیں معاف کر دیجیے۔"

لیکن سردار اُن کی طرف دیکھنے کے بجائے سارنگ بابا کی طرف دیکھ رہا تھا اور سارنگ بابا مُسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ رہے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں:

"کیوں، انوشا بیٹے؟ کُچھ پتا چلا، تم کیا سے کیا بن گئے ہو؟"

سونے کا ہاتھی

ہم سردار سے رُخصت ہو کر سیدھے تکشک ناگ کے اس مندر میں پہنچے جو پرور پُور سے کُچھ فاصلے پر چکّر کی شکل چشمے کے کنارے پر تھا اور جہاں کا پروہت میری خالہ کا شوہر تھا۔ ہم وہاں بیٹھ کے مہینے کی پورن ماشی یعنی پورے چاند کی رات کو وہاں پہنچے تھے اور اس رات وہاں میلا لگا ہوا تھا، جس میں شامل ہونے کے لیے لوگ دُور دُور سے آئے تھے۔

ہم لوگوں کے اُس ہجوم میں شامل ہو گئے جو تکشک ناگ کے مندر میں چڑھاوا دینے جا رہا تھا۔ لوگ خود بخود ہمیں راستہ دینے لگے اور اِس طرح بغیر کسی دقّت

کے ہم مندر کے اندر اُس جگہ پہنچ گئے جہاں ناگوں کے راجا تکشک ناگ کی ایک بہت بڑی اور خوف ناک مُورتی رکھی تھی۔ اس مورتی کے پاس مندر کا پروہت کھڑا تھا۔ میری خالہ کا شوہر۔

سارنگ بابا کی ہدایت کے مطابق میں نے سفید ہیرے تکشک ناگ کی نذر کیے۔ جب میں نذر کی رسمیں ادا کر چُکا تو پروہت سیندور کے پیالے میں سے ذرا سا سیندور لے کر میرے ماتھے پر نشان لگانے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ سے میرا چہرہ اُوپر اُٹھایا تو ایک دم چلّا اُٹھا:

"ارے انوشا! تُم نے اتنی دیر کر دی؟ فوراً گھر پہنچو تمہاری خالہ صُبح سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

میں حیران سا ہو کر پیچھے ہٹ آیا اور پھر مندر سے نکل کر سارنگ بابا کے ساتھ اُس گھر کی طرف چل دیا جہاں، پروہت کے کہنے کے مطابق، خالہ صُبح سے میرا انتظار کر رہی تھی۔

پروہت کی بات نے مُجھے ایک عجیب اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ میں تو خالہ سے ملے بغیر بلکہ اُن کو بتائے بغیر سارنگ بابا کے ساتھ چلا گیا تھا۔ تب سے اب تک میں نے کئی بار سوچا تھا کہ میرے یوں چلے جانے سے خالہ کے دِل پر کیا گُزرتی ہو گی۔ میری ماں نے مُجھے خالہ کے سپُرد کیا تو کیا تھا، لیکن میں صرف چند دِن اُن کے پاس رہنے کے بعد سارنگ بابا کے ساتھ نِکل گیا تھا اور اب خاصی مُدّت کے بعد واپس آیا تھا تو نہ جانے کیوں اور کیسے وہ صُبح سے میرا انتظار کر رہی تھی! ہم گھر پہنچے تو خالہ دروازے میں کھڑی جیسے میری راہ رہی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر اُسے سلام کیا تو اُس نے جھُک کر میرا ماتھا چوما، پھر سارنگ بابا کے قدم چھُوئے اور کہنے لگی:

”کیسے مہاراج، انوشا نے آپ کو مایوس تو نہیں کیا؟“

سارنگ بابا بولے۔ ”تم بھی کیا بات کرتی ہو بہن۔ میں اسے تمہاری اور تکشک مہاراج کی اجازت سے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ بلکہ یوں کہو کہ میں نے جاپ کر کے تکشک مہاراج سے انوشا کو حاصل کیا تھا اور تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ اِس

نے اتنی تھوڑی سی مُدّت میں وہ کُچھ حاصل کر لیا ہے جو دوسرے جوگی اور سنیاسی ساری ساری عُمر ٹکریں مارتے رہیں تو بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ تمہاری دعاؤں سے اب یہ وہ انوشا ہے کہ بڑے بڑے راجا اِس کے آگے سر جھُکائیں گے اور بڑے بڑے بلوان اِس کے سامنے ماتھا رگڑیں گے۔"

"شکر ہے۔ مُجھے اپنی بہن سے شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔" خالہ کہنے لگی۔ "آیئے مہاراج۔ میری بہن رات مُجھے خواب میں مِلی تھی اور اُس نے مُجھے آپ کے اور انوشا کے آنے کی خبر دی تھی اِسی لیے میں صُبح سے انتظار کر رہی تھی۔ آیئے تشریف لایئے۔"

خالہ کے یہ الفاظ سُن کر میرا سر اپنی مرحوم ماں کے احترام میں جھُک گیا۔ مُجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میری ماں کی بے چین روح میری حفاظت کرتی رہی ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس نے خالہ کو خواب میں سارنگی بابا کے اور میرے آنے کی اِطّلاع دے دی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رات ہم نے خالہ کے ہاں بسر کی۔ دِن نکلا تو سارنگ بابا نے خالہ سے کہا۔ ”لو بہن، تُم اپنے بھانجے سے مل چُکیں۔ اب اجازت دو کہ ہم اپنے بھتیجے سے مل آئیں۔“

یہ کہہ کر سارنگ بابا نے خالہ سے اجازت چاہی۔ خالہ نے زبان سے کُچھ نہیں کہا۔ شاید انہیں پہلے سے معلوم تھا کہ تکشک ناگ کے سائے میں رہنے کے باوجود انوشا کو اپنی خالہ کے پاس رہنا نصیب نہیں ہو گا۔ اس نے خاموشی سے آگے بڑھ کر میرا ماتھا چوما، سینے سے لگا کر پیار کیا اور پھر سارنگ بابا کے قدم چھُو کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ سارنگ بابا نے مُجھے ساتھ لیا اور پھر ہم اُس راستے پر ہو لیے جو پرور پُور کے شہر کی طرف جاتا تھا۔

پرور پُور میں سارنگ بابا کا بھتیجا رامو اب راجا رام بن کر راج کر رہا تھا۔ اُس نے ہماری بڑی آؤ بھگت کی اور کرتا بھی کیوں نہ۔ ہماری بدولت ہی تو وہ پرور پُور کا راجا بنا تھا ورنہ ٹکے سیر کھابے نے تو اُسے پھانسی کے تختے تک پہنچا دیا تھا۔ اب اُس کے ٹھاٹھ باٹھ ہی اور تھے۔ راجا بنتے ہی اُس کا مُورکھ پن غائب ہو گیا تھا اور اُس کی جگہ عقل نے لے لی تھی۔ ٹکے سیر بھاجی اور ٹکے سیر کھاجا کی روایت راجا انبارائی

کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی اور اِس کے ساتھ ہی انصاف کا وُہ معیار بھی اپنے آپ
ختم ہو گیا تھا کہ جس کی گردن میں پھندا پورا آئے، اُسے پھانسی دے دی جائے۔
اب تو راجا رام ایک اچھے اور نیک دِل حُکمران کی طرح پرور پُور پر حکومت کر رہا
تھا۔ وہ اچھّا چیلا تو نہ بن سکا لیکن اچھّا راجا ضرور ثابت ہوا تھا۔

پرور پُور کے تخت پر بیٹھنے کے بعد تیسرے مہینے ہی راجا رام کی شادی سیال کوٹ
کے مہاراجا کی بڑی لڑکی چندا سے ہو گئی تھی، اور چند مہینے پہلے رانی چندا نے ایک
خوب صورت گول مٹول لڑکے کو جنم دیا تھا، جس کا نام رتن رکھا گیا تھا۔

ویسے تو رتن کی پیدائش راجا رام اور رانی چندا کے لیے بہت خوشی کی بات تھی
لیکن اِس خوشی کے موقع نے اُن کے لیے ایک ایسی مشکل پیدا کر دی تھی جس
سے نکلنے کی کوئی صورت نظر نہ آ رہی تھی۔

سیال کوٹ کے مہاراجا نے اپنے نواسے کی پیدائش کی خوشی میں راجا رام کو بڑے
قیمتی اور نایاب تحفے بھیجے تھے۔ جھلِمل جھلِمل کرتے ریشمی کپڑے، جگمگ جگمگ

کرتے زیورات اور آنکھوں کو چُندھیا دینے والے ہیرے جواہرات اور اُن سب سے بڑھ کر چاندی کا بنا ہوا ایک پورے قد کا شیر۔ ایک ایک تحفہ اپنی مثال آپ تھا، اور چاندی کا شیر تو بالکل ہی لاجواب تھا۔

اور انہی تحفوں نے راجا رام اور رانی چندا کو ایک مُشکل میں پھنسا دیا تھا۔ یہ تو ضروری تھا ہی کہ راجا رام بھی اُن تحفوں کے جواب میں اپنے سُسر کو تحفے بھیجے، لیکن اس سے بڑھ کر ضروری یہ تھا کہ اُس کے ہاں سے جو تحفے جائیں، وہ ہر لحاظ سے اُن تحفوں سے بڑھ چڑھ کر ہوں جو سُسر نے اُسے دیے تھے۔

ریشمی کپڑوں، زیورات اور ہیرے جواہرات کا مسئلہ ایسا نہیں تھا جو حل نہ ہو سکے۔ راجا رام اپنے سُسر کو دُگنے تگنے ریشمی کپڑے، زیورات اور ہیرے جواہرات تحفے کے طور پر بھیج سکتا تھا۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ چاندی کے شیر کے جواب میں اُسے کیا بھیجا جائے؟ راجا رام اور رانی چندا اِس مسئلے پر کئی بار بحث کر چُکے تھے اور اپنے درباریوں بھی مشورہ کر چکے تھے۔ لیکن ابھی تک کوئی مناسب سا تحفہ سمجھ میں نہ آیا تھا۔

راجا رام کی یہ مُشکل ہمیں اُس وقت معلوم ہوئی جب رانی چندا اپنے خوب صورت گول مٹول بیٹے کو لیے سارنگ بابا کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہوئی۔ سارنگ بابا رانی چندا اور اُس کے بیٹے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جب رانی نے سارنگ بابا کے قدم چھُوئے تو اُنھوں نے پیار سے ماں بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"بیٹی، ہمیں اگر تمہاری شادی کے وقت اطلاع ملتی تو ہزار کوس سے بھی یہاں آتے اور تمھیں تمہاری شان کے مطابق کوئی تحفہ دیتے۔ پر خیر اِس کی تلافی ہم اب کیے دیتے ہیں۔ بولو بیٹی! تُم اپنے لیے کیا تحفہ پسند کرو گی؟ ہم کہنے کو جوگی سہی، لیکن اپنی بیٹی کی خواہش ضرور پوری کریں گئے۔"

رانی چندا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مہاراج! آپ کی دعاؤں سے قدرت نے مُجھے بہت کُچھ دیا ہے۔ آپ اگر مُجھے کوئی تحنتہ دینا ہی چاہتے ہیں تو بس مہربانی کر کے ہماری ایک مُشکل آسان کر دیجیے۔ میرے باپ نے رتن کی پیدائش پر جو چاندی کا شیر بھیجا ہے، اُس کے جواب میں ہم کیا بھیجیں؟"

سارنگ بابا مُسکرا کر کہنے لگے۔ "یہ کون سی ایسی بات ہے بیٹی، جس نے تمہارے لیے اتنی بڑی مُشکل پیدا کر دی ہے؟ تمہارے باپ نے چاندی کا شیر بھیجا ہے، تُم اُسے سونے کا ہاتھی بھجوا دو۔"

سارنگ بابا کی بات سُن کر راجا رام نے کہا۔ "مہاراج۔ کیوں دل لگی کی بات کرتے ہیں۔"

"میں نے تو کوئی دِل لگی نہیں کی، بیٹے۔" سارنگ بابا نے کہا۔ "تمہاری مُشکل کا حل بتایا ہے کہ چاندی کے شیر کے جواب میں سونے کا ہاتھی بھجوا دیا جائے۔"

راجا رام نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مہاراج، آپ کی مہربانی نے مُجھے یہ راج پاٹ دِلوایا ہے، ورنہ میں اِس قابل کہاں تھا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ پرور پُور کا شہر کوئی سونے کی کان نہیں ہے۔ پرور پُور کے ایک ایک گھر سے سونا لے لیا جائے تو شاید اُس سے ہاتھی کا ایک کان بھی نہ بن سکے۔"

سارنگ بابا کُچھ کہنے نہ پائے تھے کہ فضا میں ایک چنگھاڑ کی آواز گونج گئی۔ یہ کسی

ہاتھی کی چنگھاڑ تھی جو درد اور تکلیف میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

"یہ کیا ماجرا ہے؟" سارنگ بابا نے پوچھا۔ "یہ راج محل کا ہاتھی ہے، مہاراج۔" راجارام نے جواب دیا۔ "مستی میں آکر پاگل ہو گیا ہے اور سواری کے قابل نہیں رہا۔ اسے زنجیروں سے باندھ دیا گیا ہے۔ بہت کوشش کی لیکن اِس کا پاگل پن کِسی طرح دُور نہیں ہوا۔ یوں لگتا ہے جیسے موت ہی اِسے اِس مُصیبت سے نجات دِلائے گی۔"

یہ سُن کہ سارنگ بابا کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ وہ بولے "چلو، ہم چل کر دیکھتے ہیں۔ کیا عجب قُدرت نے یہ سارا کھیل تمہارے لیے ہی رچایا ہو۔"

ہم راجارام کے ساتھ اس اصطبل کی طرف چل دیے جہاں شاہی ہاتھی زنجیروں میں بندھا کھڑا تھا۔ راجارام کے علاوہ رانی چندا بھی ہمارے ساتھ تھی۔ اصطبل کے مہاوت ادب سے ایک طرف کھڑے ہو گئے اور سارنگ بابا ذرا قریب جا کر ہاتھی کو غور سے دیکھنے لگے۔ پھر اُنھوں نے راجارام سے کہا:

”کیا یہ ہاتھی تُم ہمیں دے سکتے ہو، بیٹے؟“

”یہاں جو کُچھ ہے، سب آپ کا ہے۔“ راجا رام نے کہا۔ ”لیکن یہ پاگل ہاتھی آپ کے کِس کام کا؟ آپ نے کسی اور چیز کا حکم کیا ہوتا؟“

”نہیں بیٹے۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”اس وقت تو ہمیں یہی ہاتھی چاہیے۔“

”یہ تو آپ کا ہو گیا، مہاراج۔“ راجا رام نے کہا۔ ”کُچھ اور حکم کیجیے؟“

”تم سب لوگ پیچھے ہٹ جاؤ۔“ سارنگ بابا نے حکم دیا۔ ”اور خاموش کھڑے رہو۔ کسی کے مُنہ سے ذرا بھی آواز نہ نکلے۔“

راجا رام اور رانی چندا سمیت تمام لوگ پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ سارنگ بابا نے اپنے تھیلے میں سے چند دوائیں نکال کر ہتھیلی پر رکھیں۔ اُن میں سے ایک دوا وہی چودہ ہاتھ لمبے اژدہے کی راکھ تھی۔

دوائیں ہتھیلی پر رکھ کر وہ انتظار کرنے لگے۔ ذرا دیر بعد ہاتھی زور سے چنگھاڑا۔

جیسے ہی ہاتھی نے سونڈ اُوپر اُٹھائی اور چنگھاڑنے کے لیے مُنہ کھولا، سارنگ بابا نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر وہ دوائیں اُس کے مُنہ میں ڈال دیں۔

دواؤں کے ہاتھی کے مُنہ میں جانے کی دیر تھی کہ وہ چُپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اب سارنگ بابا نے اپنے تھیلے سے تھوڑی سی راکھ اُس سانپ کی نکالی جو سردار کی بیوی کے جسم میں سے نِکلا تھا۔ وہ راکھ اُنہوں نے ہاتھی کی سونڈ میں ڈال دی اور ہاتھی کا جسم یُوں بے حرکت ہو گیا جیسے پتھّر ہو گیا ہے۔ اس کے بعد سارنگ بابا نے چودہ ہاتھ لمبے اژدہے کی راکھ ہاتھی کے تمام بدن پر مل دی۔ اِس دوران میں ہاتھی کے جسم میں ذرا سی بھی حرکت نہیں ہوئی۔

جب وہ ہاتھی کے تمام بدن پر چودہ ہاتھ لمبے اژدہے کی راکھ خوب اچھی طرح مل چُکے تو اُنہوں نے اصطبل کے ملازموں سے مخاطب ہو کر کہا:

"اس ہاتھی کے اِرد گرد اور اوپر نیچے سوکھی لکڑیوں کا ایک ڈھیر اِس طرح لگا دو کہ یہ سارے کا سارا اُس میں چھُپ جائے صرف اِس کی سُونڈ کا سِرا اور دُم کا سِرا

باہر رہنا چاہیے۔"

ملازموں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھی کو سوکھی لکڑیوں کے ڈھیر میں اِس طرح چھپا دیا گیا کہ صرف اُس کی سُونڈ کا سِرا اور دُم کا سِرا دِکھائی دے رہا تھا۔

یہ کام ہو چُکا تو سارنگ بابا نے خود شانی کو اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور مُجھے بِین پر شانی والی دُھن بجانے کا حکم دیا۔ میں بِین بجانے لگا اور وہ شانی کو لے کر ہاتھی کی سونڈ کے پاس کھڑے ہو گئے۔

جیسے جیسے بِین کی لَے تیز ہوتی گئی، شانی کی بے چینی بڑھتی گئی۔ پھِر سارنگ بابا نے شانی کی گردن چھوڑتے ہوئے اُس کا مُنہ ہاتھی کی سُونڈ کے سِرے کے قریب کر دیا۔ شانی نے ایک زور کی پھُنکار ماری۔ آگ کا ایک شعلہ سا لپکا اور ہاتھی کی سُونڈ اور اُس کے ساتھ ہی اُس کے اِرد گرد چُنی ہوئی خُشک لکڑیوں میں آگ لگ گئی۔

اب سارنگ بابا سُونڈ سے ہٹ کر ہاتھی کی دُم کی طرف آ گئے۔ اُنہوں نے وہاں

بھی یہی کیا۔ کُچھ دیر بعد ہاتھی کی دُم اور اُس کے اِرد گرد رکھی ہوئی لکڑیاں بھی جل اُٹھیں۔

اب ہاتھی، سُونڈ اور دُم، دونوں طرف سے جل رہا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی اُس کے اِرد گرد رکھی ہوئی لکڑیاں بھی تیزی سے آگ پکڑتی جا رہی تھیں۔ ہاتھی کے بدن میں یا لکڑیوں کے ڈھیر میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اُن لکڑیوں میں چھُپا ہوا ہاتھی کاٹھ کا ہاتھی ہے۔

سارنگ بابا کی ہدایت کے مطابق تین دِن تین رات ہاتھی کے گِرد آگ کا الاؤ روشن رہا۔ چوتھے روز راکھ ہٹائی گئی تو سارا ہاتھی سونے کا بن چکا تھا۔

”لو بیٹی۔“ سارنگ بابا نے رانی چندا سے کہا۔ ”تمہاری مُشکل آسان ہو گئی۔“

بھگوڑا ناگ

سونے کے ہاتھی کی بات ہوا کے پَر لگا کر اُڑی اور کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ نتیجہ یہ نِکلا کہ سونے کے ہاتھی کے ساتھ ساتھ سارنگ بابا اور انوشا بھی مہاراجا سیال کوٹ کے دربار میں پہنچے۔ اُس نے ہمیں خاص طور پر بُلوایا تھا۔ اِس لیے نہیں کہ وہ ہمیں کوئی انعام وغیرہ دے بلکہ اِس لیے کہ اپنی بیٹی رانی چندا کی طرح وہ بھی ایک مُشکل سے دوچار تھا۔ مُشکل رانی چندا کی چھوٹی بہن چمپا کے بارے میں تھی۔

چمپا کی شادی مہاراجا پورس کے چھوٹے بیٹے امر سے ہوئی تھی۔ پورس دریائے

جہلم اور دریائے چناب کے درمیانی علاقے کا راجا تھا اور اُس کی بہادری کی دھاک دُور دُور تک بیٹھی ہوئی تھی۔ اِس طرح مہاراجا سیال کوٹ کے لیے پورس کے ساتھ رشتے داری فخر کا باعث تھی۔ لیکن ایک ناگ نہ جانے کہاں سے آن ٹپکا تھا اور یُوں نظر آتا تھا، جیسے وہ اِس رشتے داری کو توڑنے پر تُلا ہوا ہے۔

چمپا شادی کے بعد مہاراجا پورس کے محل میں کُچھ دِن گُزارنے کے بعد واپس سیال کوٹ آگئی تھی۔ اُس کی واپسی کے چند دِن بعد ہی ایک ناگ اُسے چمٹ گیا تھا۔ چمپا کا شوہر امر اُسے لینے کے لیے کئی بار سیال کوٹ آچُکا تھا، لیکن جب بھی وہ آتا، اُس ناگ کو چمپا کے جسم سے لپٹا ہوا پاتا اور یہ ناگ اُس سے اس وقت تک جدا نہیں ہوتا تھا جب تک امر واپس نہیں چلا جاتا تھا۔

ناگ اگرچہ چمپا کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا تھا اور اُس نے چمپا کو یا کسی اور شخص کو کبھی ڈسنے کی کوشش نہیں کی تھی، لیکن وہ چمپا کے شوہر کے ساتھ جانے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ مہاراجا سیال کوٹ اب تک کئی جوگیوں اور سپیروں کی خدمات حاصل کر چکا تھا، لیکن وہ سب چمپا کو اُس ناگ کے پنجے سے رہائی دلانے میں ناکام

رہے تھے۔ اور اب سونے کے ہاتھی کی شہرت سُن کر مہاراجا نے ہمیں بُلایا تھا۔

مہاراجا نے ہماری بڑی خاطر مدارت کی اور پھر ہمیں امر سے ملوایا جو ابھی ایک روز پہلے ہی سیال کوٹ آیا تھا۔ اِس سے پہلے وہ چمپا کو لینے کے لیے پانچ بار آ چُکا تھا لیکن ناگ نے اُس کی ایک نہ چلنے دی تھی۔

سارے قصّے سے آگاہ ہونے کے بعد ہم نے امر کو ساتھ لیا اور چمپا کے محل کی طرف چل دیے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو چمپا اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ دھوپ میں بیٹی بال سکھا رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ ادب سے کھڑی ہو گئی اور دوپٹے سے سر ڈھانکتے ہوئے سارنگ بابا کو سلام کیا۔

"جیتی رہو بیٹی!" سارنگ بابا نے اُسے دُعا دی۔ "سہاگ قائم رہے۔"

امر جو اس وقت تک سارنگ بابا کی اوٹ میں کھڑا تھا، ایک دم سامنے آ گیا اور بڑے جوش سے کہنے لگا:

"چمپا! میں تمھیں لینے آیا ہوں۔"

یہ الفاظ امر کی زبان سے نکلے ہی تھے کہ شُوں شُوں کی سی آواز آئی۔ پھِر ایک ناگ نہ جانے کس طرف سے نمودار ہوا اور ایک دم چمپا کو لپٹ گیا۔ چمپا جیسے زمین میں گڑی کی گڑی رہ گئی لیکن اُس کی سہیلیاں مارتے خوف سے چیختی چلّاتی بھاگ گئیں۔ چمپا کے مُنہ سے نہ کوئی آواز نکلی اور نہ اُس کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہوئے۔

میں نے ایک نظر اُس ناگ پہ ڈالی۔ کالا سیاہ ناگ تھا۔ اُس نے اپنا سارا دھڑ چمپا کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور اُس کا چوڑا پھن چمپا کے سر کے اُوپر یُوں اُٹھا ہوا تھا جیسے اُس پر سایہ کر رہا ہو۔

میں نے ایک نظر اُسے دیکھا اور پھر بِین پر ایک خاص دُھن بجانا شروع کر دی۔ بِین کی آواز سُن کر ناگ پہلے تو ذرا سا چونکا، پھر چمپا کے جسم سے اُتر کر رینگتا ہوا زمین پر آیا اور مُجھ سے پانچ چھ قدم کے فاصلے پر بیٹھ کر اپنا چوڑا پھن لہرانے لگا۔

لیکن جیسے ہی میرے گلے سے جھُولتا ہوا اشانی نیچے اُتر کر ناگ کی طرف بڑھا، ناگ

بجلی کی سی تیزی دوبارہ چمپا کے جسم سے لپٹ گیا۔ شانی وہیں رُک گیا اور سر جھکا کر میری طرف دیکھنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا:

”انوشا بھائی! اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“

اتنے میں ناگ کی شُوں شُوں کی آواز آئی۔ وہ مُجھ سے مخاطب تھا۔ ”جوگی جی! میں نے یہ سب داؤں دیکھے ہوئے ہیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ سیدھے سبھاؤ یہاں سے چلے جائیں۔ میں نے ابھی تک کسی کو کُچھ نہیں کہا۔ آپ کو بھی کُچھ نہیں کہوں گا۔“

میں نے شانی کو اُٹھا کر گلے میں ڈال لیا اور اس ناگ سے کہا۔ ”تُم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟“

ناگ نے جواب دیا۔ ”چمپا رانی میری بیوی ہے اور میں اُس پاس رہنا چاہتا ہوں۔“

”تُم جھوٹ کہتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”چمپا رانی تمہاری نہیں۔ راج کُمار امر کی بیوی ہے۔ تُم نہ جانے کہاں سے آن ٹپکے ہو!“

"میں کہیں سے نہیں ٹپکا۔" ناگ نے جواب دیا۔ "اِسی محل کے باغ میں، ایک درخت کی جڑ میں، میرا گھر ہے اور چمپا رانی بچپن سے میرے ساتھ کھیلتی آئی ہے۔ اور یہ بھی جان لیجیئے! میری اور چمپا کی شادی تو اُس وقت سے ہو چُکی ہے جب ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ شادی کیا یہ۔"

"یہ ایک اور جھوٹ ہے!"

"نہیں مہاراج، میں جھوٹ نہیں بولتا۔ آپ چمپا رانی سے پُوچھ لیجیے۔ یہ چھوٹی سی تھی جب اِس نے پھولوں کی مالا میری گردنِ میں ڈال کر مُجھے اپنا شوہر مان لیا تھا۔ آپ پُوچھ لیجیے اِس سے۔"

"میں اس سے بعد میں پوچھوں گا، پہلے تم یہ بتاؤ کہ اب تک تُم کہاں تھے؟ تمہیں اگر چمپا کے شوہر ہونے کا دعویٰ تھا تو اُس وقت آتے جب چمپا کی شادی ہو رہی تھی۔ یہ کیا کہ جب اُس کا شوہر اُسے لینے کے لیے آیا تو تُم آموجود ہوئے؟"

"آپ کی بات درست ہے۔" ناگ نے کہا۔ "اُس وقت میں یہاں نہیں تھا۔ اپنی

بہن کے ہاں گیا ہوا تھا۔ وہ اننت ناگ میں رہتی ہے۔ وہ بیمار تھی اور میں اُس کی خبر گیری کے لیے اُس کے پاس ٹھہرا رہا۔ جب وہ تندرست ہو گئی تب یہاں واپس آیا اور مُجھے پتا چلا کہ چمپا کی شادی ہو گئی ہے۔ خیر، جو ہوا سو ہوا۔ اب دنیا چاہے اِدھر کی اُدھر ہو جائے، میں چمپا کو اپنے سے جُدا نہیں ہونے دوں گا۔"

"تم کُچھ اور بھی کہنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"صرف ایک بات۔" ناگ نے کہا۔ "وہ یہ کہ آپ میرے اور چمپا کے معاملے میں دخل نہ دیں۔ آپ کی عُمر دیکھ کر مُجھے ترس آتا ہے۔ آپ کو کُچھ ہو گیا تو مُجھے افسوس ہو گا۔ آپ کے تو ابھی کھیلنے کھانے کے دِن ہیں۔"

میں نے ناگ کی اس بات کو نظر انداز کرتے ہو کہا۔ "اچھّا، تو اب تُم چمپا کو چھوڑ کر ایک طرف ہو جاؤ تا کہ میں اِس سے بھی دو باتیں پُوچھ لُوں۔"

"معاف کیجیے۔ میں اِس چال میں آنے والا نہیں۔ میں نے چمپا کو چھوڑا نہیں اور آپ اِسے لے کر چمپت ہوئے نہیں۔"

"ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "چھل فریب ہم جوگیوں کی عادت نہیں۔ جو بات ہو گی سولہ آنے کھری ہو گی۔ اور تمہارے سامنے ہو گی۔"

میری یہ بات سُن کر ناگ آہستہ آہستہ چمپا کے جسم سے اُترا اور رینگتا ہوا اُس سے چند قدم کے فاصلے پر کُنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اب میں نے چمپا رانی سے کہا۔ "چمپا رانی میں جو کُچھ پوچھوں، اُس کا بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ اس بات کا بالکل خیال نہ کرنا کہ ناگ یا راج کُمار امر یہاں موجود ہے۔"

"جیسے حضور کا حکم۔" چمپا نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"سب سے پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا تُم بچپن میں اِس ناگ کے ساتھ کھیلتی رہی ہو؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ میں اور میری سہیلیاں بچپن میں باغ میں کھیلا کرتی تھیں تو ایک چھوٹا سا ناگ ہمارے ساتھ کھیل میں آ کر شامل ہو جاتا تھا، لیکن میں یہ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ ناگ یہی تھا یا کوئی اور۔"

"وہ میں ہی تھا۔" ناگ نے کہا۔ "تُم چُپ رہو؟" میں نے ناگ کو جھڑک دیا۔

”اگر تُم نے دوبارہ ہماری باتوں میں دخل دیا تو میں تمہارا مُنہ ہمیشہ کے لیے بند کر دوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے چمپا سے پوچھا:

”اب تُم یہ بتاؤ چمپا کہ جو ناگ تمہارے ساتھ کھیلا کرتا تھا، تُم نے کبھی اُس کے گلے میں پھُولوں کا ہار بھی ڈالا تھا؟“

”مُجھے ٹھیک سے کُچھ یاد نہیں۔“ چمپا نے جواب دیا۔ ”ہم اکثر باغ سے پھُول توڑ کر ہار بنایا کرتے تھے اور ہم ایک دوسرے کے گلے میں ڈالا کرتے تھے۔ ہو سکتا ہے میں نے کبھی ایک بار اِس ناگ کی گردن میں بھی ڈال دیا ہو۔“

ناگ نے کُچھ کہنے کی کوشش کی تو میں نے چھلانگ لگا کر اُس کی گردن دبوچ لی۔ اُس کی گردن ہاتھ میں آتے ہی میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں کہنا تو کُچھ اور چاہتا تھا لیکن اُسے دیکھتے ہی جیسے سب کُچھ بھُول گیا۔ میں اُسے گردن سے تھام کر لہراتا ہوا سارنگ بابا کی طرف آیا اور چیخ کر کہنے لگا:

”بابا جی! یہ تو وہی ناگ ہے جو اُس بستی میں گائے کے تھنوں سے چمٹا ہوا تھا اور پھر

ہماری کھیر کھا کر بھاگ گیا تھا۔"

سارنگ بابا مُسکرا کر بولے۔ "میں تو اِسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا، انوشا بیٹے۔ صرف اِس انتظار میں تھا کہ تُم بھی اِسے پہچان جاؤ۔"

میں نے ناگ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "دوست ہمیں بالکل یقین نہیں تھا کہ ہماری دوسری ملاقات اتنی جلدی ہو جائے گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تُم اپنی جلد بازی کی وجہ سے ساری شرطیں پوری نہیں کر سکے۔ وہ معاملہ تو جو ہے سو ہے، لیکن ہم یہاں چمپا رانی کے سِلسلے میں آئے ہیں اور میں تُم سے زیادہ نہیں، صرف اِتنا ہی کہوں گا کہ اگر چمپا رانی نے بچپن میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلتے ہو ایک ہار تمہارے گلے میں ڈال دیا تھا، تو تمہیں یہ حق نہیں ہے کہ زبردستی اُس کے شوہر بن بیٹھو۔ اور تُم تو ناگ ہو۔ ایک ناگ کسی عورت کا شوہر کیسے ہو سکتا ہے؟ شاید تم یہ سمجھ رہے ہو گے کہ کِسی نہ کِسی دِن ناگ سے آدمی کی شکل میں آجاؤ گے، لیکن یہ تمہاری بہت بڑی بھُول ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے ناگ کی طرف دیکھا۔ وہ میرے ہاتھ میں بُری طرح تِلملا رہا تھا۔ لیکن اُس کے پھن سے تناؤ اور اکڑ فُوں کی جگہ بے بسی جھلک رہی تھی۔ میری بات کے جواب میں اُس نے کُچھ کہنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کہتا بھی کیا۔ معاملہ ہی کُچھ سے کُچھ ہو گیا تھا۔

میں نے پھر ناگ سے کہا۔ "تُم نے اپنے رویّے سے، چمپا اور امر کو ہی تکلیف نہیں پہنچائی بلکہ اِن کے خاندانوں کے درمیان رشتے داری کے بندھن کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ تمہارا یہ جُرم کوئی معمولی جُرم نہیں۔ لیکن یقین رکھو کہ ہماری طرف سے یا اِن کی طرف سے تمہیں اِس جُرم کی کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔ تُم تو ہمارے بھگوڑے مجرم ہو جسے تقدیر کا ہاتھ پھر سے ہمارے پاس واپس لے آیا ہے۔ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جانا چاہیے، اِس کا فیصلہ تو سارنگ بابا نے اُسی وقت کر لیا تھا جب تمہیں گائے کے تھنوں سے چھڑا کر پٹاری میں بند کیا گیا تھا۔"

یہ کہہ کر میں نے اُس ناگ کو سارنگ بابا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لیجیے

مہاراج، آپ کا مُجرم حاضر ہے۔"

سارنگ بابا تو اُس کے لیے جیسے پہلے سے تیّار تھے۔ اُنہوں نے جھٹ اپنے تھیلے سے کُچھ دوائیں نکالیں اور ناگ کا مُنہ کھول کر اُس کے حلق میں اُنڈیل دیں۔ دوائیں اُس کے حلق سے اُترتے ہی وہ ذرا دیر کو تڑپا، پھڑکا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ سارنگ بابا نے فوراً ایک کوری ہانڈی منگوائی، اُس میں کُچھ دوائیں چھڑکیں، ناگ کو اُس میں بند کیا، اُوپر سے کُچھ دوائیں ڈالیں اور پھر ہانڈی کا ڈھکنا مضبوطی سے بند کر کے اُس کے چاروں طرف ایک ایک اُنگل موٹا مٹّی کا لیپ کر دیا۔

اِس کام سے فارغ ہو کر وہ چمپا سے مخاطب ہوئے۔ "چمپا بیٹی، تُم بڑی بھاگوان ہو۔ قدرت تمہارا اور امر بیٹے کا جوڑ قائم رکھے۔ تمہیں اپنا شوہر مل گیا، امر کو اُس کی بیوی مل گئی اور ہمیں ہمارا بھگوڑا ناگ مل گیا۔ قدرت یُوں ہی سب کے کام سنوارا کرتی ہے۔"

اور پھر محل میں مبارک سلامت کا ایک شور سا مچ گیا۔ چھوٹے بڑے سب چمپا

اور امر کو مبارک باد دینے لگے اور ہمارے پاؤں چھُونے اور ہاتھ چُومنے لگے۔ یُوں لگتا تھا جیسے راوی سے لے کر چناب تک خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے اور ابھی اس لہر کو چناب سے چل کر جہلم تک جانا تھا۔

ہم سیال کوٹ میں صرف سات دِن تک ٹھہرے اور وہ بھی صرف اِس لیے کہ ایک تو چمپا کی رُخصتی کی تمام تیّاریاں مکمّل ہو جائیں اور دوسرے یہ کہ سارنگ بابا نے بھگوڑے ناگ کو جس ہنڈیا میں ڈالا تھا، وہ سات روز تک دہکتے ہوئے تنور میں رکھی رہی۔

راج کُمار امر نے سارنگ بابا کو پہلے ہی اِس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ سارنگ بابا اور میں اُس کے ساتھ جائیں۔ چنانچہ جب چمپا رانی کی ڈولی نہایت شان و شوکت کے ساتھ سیال کوٹ سے مہاراجا پورس کی راجدھانی کی طرف روانہ ہوئی تو راج کُمار امر اور دوسرے لوگوں کے علاوہ سارنگ بابا، میں اور شانی بھی اُس کے ساتھ تھے۔

پورس کے دربار میں

میں نے مہاراجا پورس کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ نکلتا ہوا اُونچا لمبا قد، جو پانچ ہاتھ سے کم نہیں تھا، گٹھا ہوا بھاری جسم اور بارُعب چہرہ۔ اُس کی آنکھوں میں عُقاب کی سی تیزی تھی اور اُس کا چوڑا چکلا چہرہ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی شیر ببّر ہے جو کوئی دم میں اپنے شکار پر جھپٹا چاہتا ہے۔

میں چند لمحے اُس کے چہرے پر نگاہیں جمائے کھڑا رہا اور پھر میرا سر خود بخود اُس کے آگے جھک گیا۔ یہ وہ راجا تھا جس نے میرے باپ، ٹیکسلا کے راجا ابھی کو ایک بار نہیں، کئی بار ناکوں چنے چبوائے تھے۔ جب میں کشمیر کی طرف جاتے

ہوئے ٹیکسلا سے گزر رہا تھا تو ایک سرائے میں مسافروں کی زبانی مُجھے معلوم ہوا تھا کہ کُچھ روز پہلے مہاراجا پورس اور راجا امبھی کے درمیان ایک خوفناک لڑائی ہوئی ہے۔ اِس لڑائی میں پورس نے امبھی کی فوجوں کا پلیتھن نکال کر رکھ دیا۔ اس کے ہزاروں پیادے، سپاہی اور سوار کھیت رہے تھے۔ اُس کے نِصف سے زیادہ جنگی رَتھ بے کار ہو گئے تھے اور اُس کے گھُڑسواروں میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے کوئی زخم نہ آیا ہو۔ مہاراجا پورس کو ہی نہیں، راجا امبھی کے وزیروں اور درباریوں کو بھی یقین تھا کہ اِس شکست کے بعد راجا امبھی پھر کبھی راجا پورس کے مُقابلے میں آنے کی بات نہیں کرے گا۔

اس خبر نے اُس وقت بھی میرے دِل پر کوئی خاص اثر نہیں کیا تھا۔ میں نے اسے یُوں سُنا تھا جیسے شکست میرے باپ کی نہیں، کسی اور راجا کی تھی۔ اور اِس وقت میری نگاہوں کے سامنے لمبے قد اور بارُعب چہرے والا مہاراجا پورس تھا جس نے راجا امبھی کو عبرت ناک شکست دی تھی۔ لیکن میں اُس کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اُس نے میرے باپ کو نہیں، کسی اور راجا کو شکست دی تھی۔

مہا راجا پورس نے ہمیں بڑی عزّت سے اپنے محل کے خاص مہمان خانے میں ٹھہرایا اور اپنے بیٹے امر کو تاکید کر دی کہ ہماری خاطر مدارات میں کوئی کوتاہی نہ ہونے پائے۔ امر ہماری خدمت میں ہر وقت میں رہنے لگا جیسے وہ راج کُمار نہیں، مہمان خانے کا ملازم ہے۔

ایک دِن گُزرا، دو دِن گُزرے اور پھر ایک ایک کر کے دس دِن گُزر گئے۔ ہم مہا راجا پورس کے مہمان خانے میں دس دِن سے پڑے روٹیاں توڑ رہے تھے۔ اِن دس دِنوں میں راج کُمار امر کو چھوڑ کر ہم نے راجا پورس کے خاندان کے کسی شخص کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ راجا کے دربار کا کوئی ملازم، امیر، وزیر یا درباری بلکہ دربان تک ہمارے پاس نہیں آیا تھا۔ مُجھے یہ خیال ہونے لگا تھا کہ مہا راجا ہمیں شاید بھول ہی گیا ہے۔

لیکن میرا یہ خیال غَلَط تھا۔ راجا پورس کی نگاہیں عُقاب کی نگاہیں تھیں اور اُس کا ذہن شاید ہاتھی کا ذہن تھا۔ جو شخص ایک بار اُس کی نظروں میں آجائے، پھر وہ اُسے بھولتا نہیں تھا۔ اور ہماری تو بات ہی دوسری تھی۔

اور یہ بات ہمیں گیارہویں دِن معلوم ہوئی جب راجا کے دربار سے ہمارے لیے درباری لباس آئے۔ دربار میں ایک جشن تھا۔ ہمیں وہ خاص درباری لباس پہن کر جشن میں شامل ہونا تھا۔ یہ جشن امر کی بیوی چمپا کے آنے کی خوشی تھا۔

ہم دربار میں پہنچے تو ہمیں مہاراجا نے اپنے قریب خاص نشستوں پر جگہ دی، ہم اگرچہ اِس سے پہلے ایک جشن میں شامل ہو چُکے تھے، لیکن وہ جشن ایک بستی کے سردار کا تھا اور یہ جشن مہاراجا پورس کی طرف سے تھا جس کی شان و شوکت اپنا جواب آپ تھی۔

جشن کا آغاز چند مذہبی رسموں سے ہوا۔ یہ رسمیں ادا ہو چکیں تو شاعر آگے بڑھے، اُنھوں نے جھک کر مہاراجا کو سلام کیا اور پھر اُس کی شان میں چند شعر پڑھے۔ اِن شعروں میں مہاراجا کی شجاعت، ہمّت، حوصلے، شان، آن بان، غیرت کے ساتھ ساتھ اُس کی سعادت اور دریادِلی کی بڑے خوب صورت انداز میں تعریف کی گئی تھی۔ شاعر شعر پڑھ چُکے تو مہاراجا پورس نے قیمتی ہیروں کی دو مالائیں انہیں انعام میں دی۔

میرا خیال تھا کہ سردار والے جشن کی طرح یہاں بھی کُچھ کھیل تماشے ہوں گے، لیکن شاعروں کے بعد ناچنے والیوں کی ٹولیاں آ گئیں۔ ایک ٹولی ناچ ختم کرتی تو دوسری شروع ہو جاتی۔ دوسری کا ناچ ختم ہوتا تو تیسری آ جاتی، کوئی دو درجن ٹولیاں تھیں اور کسی ٹولی میں بھی ناچنے والوں کی تعداد دس سے کم نہیں تھی۔ مہا راجا نے ہر ٹولی کو اشرفیوں کی ایک ایک تھیلی انعام میں دی۔ ناچنے والوں کی ٹولیاں ہٹیں تو دربار میں ایک بجلی سی کوند گئی۔ لیکن یہ بجلی آسمانی نہیں، زمین کی ہی تھی۔ مہا راجا کے دربار کی سب سے زیادہ نامور، سب سے زیادہ خوبصورت اور سب سے زیادہ تیز طرار رقّاصہ اُوشا ایک پردے کی اوٹ سے نکل کر درباریوں کے درمیان آ گئی۔

اُوشا نے آگے بڑھ کر مہاراجا پورس کو سلام کیا اور پھر اُس کی نظریں مہاراجا سے ہٹ کر درباریوں کا جائزہ لیتے ہوئے میرے چہرے پر آ کر رُک گئیں۔ میں اور سارنگ بابا اگرچہ خاص درباریوں کے لباس میں تھے، لیکن یہ لباس ایک طرح سے شاہی سپیروں کا لباس تھا۔ بِین میرے ہاتھ میں تھی اور سارنگ بابا کے ہاتھ

میں بھی اور شانی بڑے مزے سے میرے گلے میں لپٹا ہوا جھُول رہا تھا۔

اُوشا چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی بالکل میرے سامنے آ کر رُک گئی اور بولی ”اُٹھو! آؤ! تُم بِین بجاؤ، میں ناچوں گی۔“ میں حیران رہ گیا۔ سارنگ بابا کہنے لگے۔

”اری لڑکی! جانتی بھی ہو یہ کون ہے؟“

اُوشا نے بے پروائی سے کہا۔ ”نہیں جانتی، تو جان لوں گی۔ اُٹھو! آؤ بِین بجاؤ۔“

یہ کہتے ہوئے اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور اپنی طرف کھینچنے لگی۔ میں نے بے بسی سے سارنگ بابا کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اُن سے اجازت طلب کی۔ اُنھوں نے ہاتھ بڑھا کر شانی کو میرے گلے سے اُتار کر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولے:

”چلو بیٹے، آگے بڑھو، یہ اُوشا ہے تو تُم انوشا ہو۔ ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“

سارنگ بابا کے یہ الفاظ سُنتے ہی میری ساری ہچکچاہٹ دُور ہو گئی اور میں بِین سنبھال کر اُس کھلی جگہ میں آ گیا جہاں ناچنے والی لڑکیاں ناچتی رہی تھیں۔ یہ جگہ مہاراجا کے تخت کے عین سامنے ایک بڑے سے دائرے کی شکل میں تھی۔ اُوشا بھی آگے بڑھی اور اُس خالی دائرے کے ایک گوشے میں بیٹھ گئی۔

میں نے سارنگ بابا کی سکھائی ہوئی ایک دُھن بجائی شروع کی۔ اُوشا بڑے اطمینان سے فرش پر بیٹھی دُھن کو سُنتی رہی اور آہستہ آہستہ پاؤں ہلاتی رہی۔ میں وہ دُھن چھوڑ کر ایک اور دُھن بجانے لگا۔ وہ پھر بھی اُسی طرح بیٹھی پاؤں ہلاتی رہی۔

میں نے ایک ایک کر کے کوئی دس دُھنیں بدلیں، لیکن اُوشا بڑے آرام سے بیٹھی اُنہیں سُنتی رہی اور آہستہ آہستہ پاؤں ہلاتی رہی۔ دسویں دُھن بجاتے ہوئے میری اور اُس کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں:

”کوئی ایسی دُھن بجاؤ جو اُوشا کے لائق ہو۔ یہ کیا پِیں پِیں کر رہے ہو۔“

اور میں سب کُچھ چھوڑ کر ایک دم مہا تالی پر آ گیا۔ مہا تالی چھڑی ہی تھی کہ اُوشا تڑپ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور پھر جو اُوشا نے ناچنا شروع کیا تو کیا بڑے، کیا چھوٹے سب درباریوں پر جادُو سا کر دیا۔ جیسے جیسے میری بِین کی دُھن تیز ہوتی گئی، اُوشا کے ناچ میں تیزی آتی گئی۔

اب رات آدھی سے زیادہ بیت چُکی تھی۔ اتنی دیر تک بِین بجاتے رہنے کے باوجود میں اپنے آپ کو برابر تازہ دم محسوس کر رہا تھا اور پورے جوش سے بِین بجائے جا رہا تھا۔ اُوشا بھی یوں جوش سے ناچ رہی تھی جیسے وہ تھکاوٹ نام کی کسی چیز کو جانتی ہی نہیں۔

یہ طلِسم نہ جانے اور کتنی دیر جاری رہتا کہ خوف اور درد میں ڈوبی ہوئی ایک چیخ نے سب درباریوں کو چونکا دیا۔ یہ چیخ مہاراجا پورس کے بڑے بیٹے کی تھی جو مہا راجا کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ بِین خود بخود میرے ہونٹوں سے الگ ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اُوشا کے ناچتے پاؤں رُک گئے۔

میری نگاہیں فوراً مہاراجا پورس کے تخت کی طرف اُٹھیں۔ ایک سانپ نے مہا راجا کے بڑے بیٹے کی پنڈلی پر ڈس لیا تھا اور اب وہ مہاراجا کے پاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا کہ سارنگ بابا کے ہاتھوں میں جھُولتا ہوا شانی اپنی جگہ سے اُچھلا اور اُس سانپ سے گُتھ گیا۔ مہاراجا پورس گھبراہٹ کے عالم میں سانپ! سانپ! کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

دربار میں چاروں طرف سانپ سانپ کا شور برپا ہوا اور ایک افراتفری سی مچ گئی۔ سارنگ بابا خود مہاراجا کے بڑے راج کمار کے پاس پہنچ گئے اور ذرا سی دیر میں سانپ کاٹے کا اثر دور کر دیا۔

اتنی دیر میں شانی اُس سانپ کو قابو میں کر چکا تھا۔ وہ اُس کی گردن کو مُنہ میں دبائے میرے سامنے لے آیا۔ اور کہنے لگا:

”انوشا بھائی، مُجرم حاضر ہے!“

میں نے جھُک کر ایک ہاتھ سے اُس سانپ کی گردن تھام لی اور دوسرے ہاتھ

سے شانی کو اُٹھا کو اپنے گلے میں ڈال لیا۔ پھر میں نے اُس سانپ کی طرف دیکھا۔ کوئی ہاتھ بھر کا تھا۔ شمعوں کی روشنی میں اُس کی جلد چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔

دربار میں ابھی تک افراتفری سی مچی ہوئی تھی۔ میں سانپ کو تھامے مہاراجا پورس کی طرف بڑھا، جھک کر اُنہیں آداب کیا اور پھر کہنے لگا۔

"مہاراج! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کسی دُشمن نے آپ پر وار کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے وار میں کام یاب تو نہیں ہو سکا لیکن ابھی پتا چل جاتا ہے کہ وہ دُشمن کون ہے اور اُس نے کس کو اپنا آلہ کار بنایا ہے۔ آپ حکم دیں مہاراج کہ سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں اور کوئی شخص دربار سے باہر نہ جائے۔"

مہاراجا پورس نے اُسی وقت گرج دار آواز میں حکم دیا کہ سب لوگ بیٹھ جائیں۔ اُن کے حکم کی دیر تھی کہ سب درباری فوراً اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ سارنگ بابا بڑے راج کمار کو سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے۔ میں

نے اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے سانپ سے کہا۔

”او کم بخت! بتا تُجھے یہاں کون لایا ہے؟“ ناگ نے میری اِس بات کا کوئی جواب نہ دیا تو میں نے کہا۔ ”تُجھے اگر زندگی عزیز ہے تو سچ سچ بتا دے۔ تجھے یہاں کون لایا ہے، ورنہ یاد رکھ! میں شانی کو حکم دُوں گا اور وہ ابھی تُجھے جلا کر بھسم کر دے گا۔“

سانپ نے ہچکچاہٹ کے بعد میرے سوال کے جواب میں صرف ایک لفظ کہا اور وہ لفظ تھا، ”اُوشا۔“

سانپ سے اُوشا کا نام سُنتے ہی میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُوشا غائب تھی۔ اُسے میرے قریب ہی موجود ہونا چاہیے تھا۔ افراتفری میں اُسے کھِسک جانے کا موقع مل گیا تھا۔

میں نے مہاراجا پورس کو آداب کیا اور کہا۔ ”مہاراج، اِس سانپ کو یہاں اُوشا لے کر آئی تھی۔“

یہ سُنتے ہی مہاراجا غصّے سے تھرّا اُٹھے۔

”ہیں! اُوشا؟ اُسے فوراً گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔“

مہاراجا پورس کے سپاہی اُسی وقت چاروں طرف پھیل گئے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ ذرا کی ذرا میں اُسے گرفتار کر کے مہاراجا کے قدموں میں ڈال دیں گے۔ لیکن یہ اُن کی خوش فہمی تھی۔ اُنھوں نے محل کا چپّا چپّا دیکھ ڈالا، شہر کا کونا کونا چھان مارا، اِرد گرد کی تمام بستیاں دیکھ ڈالیں، لیکن اُوشا کا کہیں پتا نہ چلا۔

شیش ناگ کی بیٹی

مسلسل ایک ماہ تک اُوشا کی تلاش جاری رہی۔ چناب سے جہلم تک کے درمیانی علاقے کی کوئی بستی نہ تھی جہاں مہاراجا کے سپاہی اُوشا کی تلاش میں نہ پہنچے ہوں۔ یہی نہیں، چناب کے پار راجا سیال کوٹ کو بھی پیغام پہنچا دیا گیا تھا اور اُس کے سپاہیوں نے بھی چناب سے لے کر راوی تک کا سارا علاقہ چھان مارا لیکن اُوشا کو ملنا تھا نہ ملی۔ صرف اُس کا سانپ تھا جو ہماری قید اور نگرانی میں تھا۔

ہم مہاراجا پورس کے خاص مہمان خانے میں روٹیاں توڑ تے تھے۔ مہاراجا کے سپاہی اُوشا کی تلاش میں جو بھاگ دوڑ کر رہے تھے، اُن کی خیر ہمیں برابر ملتی رہتی تھی

لیکن میں دیکھ کر حیران ہوتا تھا کہ سارنگ بابا سپاہیوں کی ناکامی کی خبریں سُن کر ذرا بھی فکر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ جیسے یہ اُن کے لیے کوئی بات ہی نہ تھی۔ حالانکہ یہی سارنگ بابا تھے کہ جب بستی کا سردار اپنا بچّہ گُم ہونے پر اُن کے پاؤں پر گر گیا تھا تو اُنہوں نے فوراً ہی مجُھے حکم دیا تھا کہ ذرا دیکھو تو سہی، ہمارے دوست کا بچّہ کہاں ہے؟

سارنگ بابا چاہتے تو ہم اُوشا کے ناگ سے پُوچھ گچھ کر سکتے تھے اور اگر وہ چاہتے تو سردار کے بچّے کی طرح یہاں بھی اُوشا کی تلاش کا حکم دے سکتے تھے، لیکن اُنہوں نے ایک بار بھی اُوشا کا ذکر نہیں کیا تھا۔ سارنگ بابا کے اِس رویّے پر مجُھے حیرانی تھی۔

جب مہاراجا پورس کے سپاہی اُوشا کی تلاش میں ناکام ہو گئے اور تھک ہار کر بیٹھے رہے تو پھر مہاراجا کو ہمارا خیال آیا اور وہ ٹھیک آدھی رات کے وقت اُس مہمان خانے میں آئے جہاں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا۔ سارنگ بابا کو جیسے پہلے سے اِس کا اندازہ تھا۔ وہ مجُھے باتوں میں لگائے وقت گزار رہے تھے۔ دروازہ کھُلا تھا۔ جیسے

ہی مہاراجا نے دہلیز کے اندر قدم رکھا، ہم دونوں نے اُٹھ کر آداب کیا اور سارنگ بابا کہنے لگے:

"مہاراج! آپ اور یہاں! آپ نے ہمیں کیوں نہ بُلوالیا؟" مہاراجا پورس ایک اُداس سی ہنسی ہنس دیے اور بولے "اس وقت مہاراج ہم نہیں، آپ ہیں۔ میں یہاں اُس پریشانی کا علاج ڈھونڈنے آیا ہوں جس نے پچھلے ایک مہینے سے میرا دِن کا چین اور رات کا آرام چھین رکھا ہے۔"

"حکم کیجیے، مہاراج!" سارنگ بابا نے جھُک کر آداب کرتے ہوئے کہا۔ "ہم جوگیوں اور سنیاسیوں کا تو دھرم ہی دوسروں کی سیوا کرنا ہے۔ راجا پرجا سب کی سیوا۔"

مہاراجا پورس نے چند لمحے خاموشی اختیار کی، پھر کہنے لگے۔ "آپ کو جشن کی رات یاد ہو گی، جب ایک سانپ نے ہمارے بڑے بیٹے کو ڈس لیا تھا اور اُوشا غائب ہو گئی تھی۔"

”بڑی اچھّی طرح یاد ہے، مہاراج۔“ سارنگ بابا نے کہا۔ ”بڑے راج کمار کی قسمت اچھی تھی کہ ہم نے فوراً ہی اُس کے جسم سے سانپ کا زہر نکال دیا۔ میری دُعا ہے کہ بڑے راج کُمار کو قدرت ہر مُصیبت سے دُور رکھے۔ اولاد غریب کی ہو یا امیر کی، جھونپڑی میں پلے بڑھے یا راج محلوں میں، ماں باپ کی آنکھوں کی روشنی ہوتی ہے۔“

”ہم اُوشا کی بات کر رہے تھے۔“ مہاراجا پورس نے کہا۔

”ہاں مہاراج۔“ سارنگ بابا بولے۔ ”اس کا سانپ اب تک ہمارے پاس ہے۔ قسمت کی بات ہے کہ ایسا سانپ ہمارے ہاتھ آ گیا۔“

”لیکن اُوشا ہمارے ہاتھ نہیں آئی۔“ مہاراجا نے کہا۔ ”ہمارے سپاہیوں نے سلطنت کا چپّا چپّا دیکھ ڈالا ہے۔ اور تو اور ہمارے سمدھی راجا سیال کوٹ نے بھی اپنی سی کوشش کر دیکھی لیکن راوی سے لے کر جہلم تک سارے علاقے کی تلاش کے باوجود اُوشا کا پتا نہیں چل سکا۔“

”مہاراج، ہو سکتا ہے وہ جہلم کے پار چلی گئی ہو۔“ سارنگ بابا نے کہا۔

”جہلم کے پار۔“ مہاراجا نے کہا۔ ”امبھی کی ریاست میں؟ اس امبھی کی پناہ میں جو ہمارا جانی دُشمن ہے، جو میدانِ جنگ میں ہمارے مُقابلے میں آ کر ایک بار نہیں، کئی بار مُنہ کی کھا چکا ہے۔ پر سوال یہ ہے کہ اُوشا جیسی لڑکی ذرا سی دیر میں اِتنی دور کیسے پہنچ سکتی ہے؟ کیا وہ کوئی بھُوت پریت تھی؟“

”یہ تو وہی جانے۔“ سارنگ بابا نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مہا راجا پورس تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر کہنے لگے۔ ”سارنگ مہاراج، ہم جانتے ہیں کہ امبھی ہمارا جانی دُشمن ہے اور وہ ہمیں نقصان پہنچانے کے لیے اوچھے سے اوچھا حربہ اختیار کر سکتا۔ لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ اُوشا کے واقعے سے یہ گُمان ہوتا ہے کہ شاید اُس نے ہماری جان لینے کے لیے اُوشا کو اپنا آلۂ کار بنایا ہو۔ اُوشا نے ہمارے ہی محل میں پرورش پائی ہے اور اِس سے پہلے ایک بھی موقع ایسا نہیں آیا جب ہمیں اُس کی وفاداری پر شک ہوا ہو۔ ہمارا خیال تھا کہ جب اُوشا سامنے آئے گی تو پتا چل جائے گا کہ اصل بات کیا ہے۔ لیکن

قسمت کی بات کہ سپاہیوں کی مہینا بھر کی بھاگ دوڑ کے باوجود اُوشا ہمارے ہاتھ نہیں آ سکی۔ یقین کیجئے مہاراج، اِس ایک مہینے میں ایک رات بھی ہم آرام کی نیند نہیں سو سکے۔ اس لیے نہیں کہ ہمیں امبھی سے کوئی خطرہ ہے، بلکہ صرف اِس لیے کہ ہمیں سچّی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ جب تک ہمیں سچّی بات معلوم نہ ہو جائے، ہم اپنے جانی دُشمن کے خلاف بھی اپنے دِل میں میل نہیں رکھنا چاہتے۔"

"تو اب ہمارے لیے کیا حکم ہے، مہاراج؟" سارنگ بابا نے کہا۔

"کسی طرح اُوشا کا پتا چلایئے۔" مہاراجا پورس نے کہا۔ "اُوشا ملے تو سچّی بات کا پتا چلے، اور سچّی بات کا پتا مِلے تو ہماری پریشانی ختم ہو اور ہمیں آرام اور سُکھ کا سانس نصیب ہو۔"

سارنگ بابا نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "مہاراج، ہم تو جوگی اور سپیرے ہیں۔ اُوشا کوئی ناگن تو نہیں ہے کہ ہم اُسے بین بجا کر کہیں سے نکال لائیں۔"

اب تک مہاراجا پورس نے بڑے رکھ رکھاؤ سے باتیں کی تھیں لیکن سارنگ بابا کی

مُسکراہٹ نے اُنہیں یہ احساس دِلا دیا کہ یہاں رکھ رکھاؤ سے کام نہیں چلے گا۔ اُنہوں نے شاہی رعب داب ایک طرف رکھتے ہوئے سارنگ بابا کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور کہا:

''مہاراج مُجھے اِس پریشانی اور مُصیبت سے چھٹکارا دلائیے۔ آپ کہنے کو جوگی اور سپیرے سہی لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ اور بہت کُچھ ہیں۔ آپ چندا رانی کے لیے سونے کا ہاتھی بنا سکتے ہیں۔ چمپا بیٹی کو ناگ کے پنجے سے نکال کر امر بیٹے کا گھر آباد کر سکتے ہیں۔ امر کے بھائی کو زہریلے ناگ کے ڈسنے پر چٹکیوں میں تندرست کر سکتے ہیں، لیکن پورس کے لیے کُچھ نہیں کر سکتے؟ کیا باپ اپنے بیٹوں سے اتنا ہی گیا گُزرا ہے؟''

میں چونک سا گیا۔ مہاراجا پورس شاید زندگی میں پہلی اور آخری بار اپنے آپ کو ''ہم'' کے بجائے میں کہہ رہے تھے۔

''ایسا نہ کہیے، مہاراج۔'' سارنگ بابا نے آگے بڑھ کر مہاراجا کے ہاتھ تھامتے

ہوئے کہا۔ ”ایسا نہ کہیے۔ آپ تو اِس دھرتی کی آبرو ہیں۔ آپ تو ایسے راجا ہیں جنہیں دنیا والے رہتی دُنیا تک عزّت کے ساتھ یاد کریں گے۔“

یہ کہہ کر سارنگ بابا نے مہاراجا کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا۔ پھر وہ مُجھ سے کہنے لگے۔

”انوشا بیٹے! قدرت نے تمہیں وہ طاقت بخشی ہے کہ بڑے بڑے راجا تمہارے آگے سر جھکائیں اور بڑے بڑے بلوان تمہارے سامنے کان پکڑیں اور ماتھا رگڑیں۔ لیکن آؤ اور آگے بڑھ کر مہاراج کے ہاتھوں کو بوسہ دو۔ ایک دِن آئے گا کہ تُم اپنی اِس خُوش قیمتی پر ناز کرو گے کہ تُم نے مہاراجا پورس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا ہے اور اُنہیں آنکھوں سے لگایا ہے۔“

سارنگ بابا کا حکم پا کر میں نے مہاراجا کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ پہلے اُنہیں چُوما اور پھر نہایت احترام کے ساتھ آنکھوں سے لگایا۔

میں نے مہاراجا کے ہاتھوں کو آنکھوں سے لگایا ہی تھا کہ سارنگ بابا کی آواز سُنائی

دی۔

"انوشا بیٹے! تمہیں یاد ہو گا کہ ایک بار تُم ہمارے دوست سردار کا وہ بچّہ ڈھونڈ کر لائے تھے جو اُس کے دُشمن اُٹھا لے گئے تھے۔ اب ایک بار پھر ذرا تکلیف کرو اور دیکھو کہ اُوشا کہاں ہے؟"

سارنگ بابا کے اِن الفاظ کے ساتھ ہی میں نے یُوں محسوس کیا جیسے میں ایک گھنے جنگل میں ہوں۔ میں نے اپنے اِرد گرد دیکھا۔ نہایت گھنا اور خُوف ناک جنگل تھا۔ تاریکی اتنی زیادہ کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دے۔ اِس تاریک اور خوف ناک جنگل میں ایک ہاتھ سے اپنی بِین سنبھالے اور دوسرے ہاتھ سے جھاڑیوں اور درختوں کی جھُکی ہوئی شاخوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک خاص قسم میری بُو میری رہنمائی کر رہی تھی۔ یہ وہی بُو تھی جو مُجھے تنکشک کے مندر کے شمال میں پہاڑی کے دوسری طرف وادی میں اُس پُراسرار غار تک لے گئی تھی جس کے دروازے ایک بھاری بھر کم ناگ پہرا دے رہا تھا اور جس کے اندر سارنگ بابا نے میرے لیے جاپ کیا تھا۔ اس عجیب و غریب اور پُراسرار بُو

کی رہنمائی میں نہ جانے کتنی دیر تک میں اِس خوف ناک جنگل میں چلتا رہا۔ آخر درختوں کی گُنجانی کم ہوئی۔ اور ایک تھوڑی سی کھُلی جگہ نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک غار کا دروازہ نظر آیا جس کے دروازے پر ایک بھاری بھر کم سانپ کُنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ وہ عجیب و غریب اور پُر اسرار بُو بھی اُسی سانپ کے جسم سے آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

سانپ کو دیکھنے ہی قدرتی طور پر میرے ہاتھ حرکت میں آئے اور میں نے بِین ہونٹوں سے لگائی۔ لیکن ابھی بجانے نہ پایا تھا کہ ایک آواز میرے کان میں آئی:

”انوشا مہاراج! پہچانا نہیں مجُھے؟ میں تو آپ کا پُرانا خادم ہوں۔ میں ہی تو تھا جو آپ کو سارنگ مہاراج کے غار تک لایا تھا۔ آیئے، تشریف لایئے۔“

یہ غار کے دروازے پر بیٹھے ہوئے بھاری بھر کم سانپ کی آواز تھی۔ میں نے مُسکراتے ہوئے بِین ہونٹوں سے ہٹالی اور غار کے اندر داخل ہو گیا۔

اندر اُوشا بیٹھی تھی۔ مجُھے دیکھتے ہی ایک دم کھڑی ہو گئی اور حیرانی سے بولی ”تُم!

تُم یہاں کیسے آ گئے تکشک مہاراج کے خادم نے تمہیں اندر کیسے آنے دیا؟"

"تکشک مہاراج کا خادم؟"

"ہاں۔" اُوشا بولی۔ "وہ ناگ جو اِس غار کے دروازے پر پہرا دیتا ہے، تکشک مہاراج کا خاص خادم ہے۔ اِس کے ہوتے ہوئے کِسی کو اندر آنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ معلوم نہیں تُم کیسے اندر آ گئے؟"

"تکشک مہاراج کا یہ خادم تمہیں کیسے ملا؟" میں نے پوچھا۔

"میں شیش ناگ کی بیٹی ہوں۔" اُوشا نے کہا۔ "اور شیش ناگ اور تکشک دونوں بھائی ہیں۔"

"تم۔۔۔۔ تم۔۔۔ شیش ناگ کی بیٹی ہو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں۔" اُوشا نے جواب دیا۔ "اُسی کی مہربانی سے مُجھے یہاں پناہ ملی ہے۔ معلوم نہیں تُم کیسے اندر آ پہنچے ہو۔"

میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ ’’اُوشا! میں شیش ناگ کا بیٹا تو نہیں لیکن مُجھ پر شیش ناگ اور تکشک ناگ دونوں کا سایہ ہے اور تکشک مہاراج کا خادم جو اِس غار کے دروازے پر پہرا دے رہا ہے، اُس سے میری ملاقات ایک دفعہ پہلے بھی ہو چُکی ہے۔ اس کے جسم والی پُر اسرار بُو نے مُجھے سارنگ بابا کے غار تک پہنچایا تھا اور اِسی بُو نے مُجھے اِس غار تک پہنچایا ہے۔ وہاں بھی اِس نے میرا راستہ نہیں روکا تھا اور یہاں بھی اُس نے میرا استقبال کیا ہے۔‘‘

اُوشا میری طرف یُوں دیکھنے لگی جیسے اُسے میری بات کا یقین نہ ہو۔ وہ مری ہوئی آواز میں کہنے لگی ’’تو یُوں کہو کہ میرے محافظ نے ہی مُجھے تمہارے حوالے کر دیا ہے۔‘‘

’’یہی سمجھ لو۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اور اب میں تمہیں یہاں سے لے جا کر مہاراجا پورس کے حوالے کروں گا تا کہ وہ انصاف کے تقاضوں کے مطابق مُجرم کو سزا دے سکیں۔‘‘

"لیکن میں نے تو کوئی جُرم نہیں کیا۔" اُوشا بولی۔

"وہ سانپ جس نے بڑے راج کُمار کی پنڈلی پر ڈسا تھا اور جو مہاراجا پورس کو ڈسنا چاہتا تھا، وہ سانپ تُم اپنے ساتھ لائی تھیں۔ تمہارا ایک دم دربار سے غائب ہو جانا یہ بتاتا ہے کہ تم نے مہاراجا کے کسی دُشمن کا آلۂ کار بن کر مہاراجا کی جان لینے کی کوشش کی تھی اور تمہارا یہ جرم ایسا نہیں ہے جیسے مُعاف کیا جا سکے۔"

"نہیں، نہیں۔" اُوشا نے کہا۔ "میں نے مہاراجا کے ٹُکڑوں پر پرورش پائی ہے۔ میں تو اُن کی جان لینے کی بات سوچ بھی نہیں سکتی۔ اُن کے کسی دُشمن کا آلۂ کار بننے سے پہلے تو میں اپنا گلا آپ گھونٹ لوں گی۔"

"تو پھر تم اِس سانپ کو ساتھ کیوں لائی تھیں؟" میں نے پوچھا۔ "اور جب اُس نے بڑے راج کُمار کو ڈسنے کے بعد مہاراجا کی طرف رُخ کیا تو تُم دربار سے غائب کیوں ہو گئی تھیں؟"

"میں اُس سانپ کو ساتھ نہیں لائی تھی۔" اُوشا نے کہا۔ "میں نے تو اُسے گھر پر

ہی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن وہ میرا پالتو سانپ ہے اور میں ہر وقت اُسے اپنے ساتھ رکھتی ہوں۔ جب میں تمہاری بین کی دُھن پر ناچ رہی تھی تو وہ میری تلاش میں دربار میں چلا آیا تھا۔ ہو سکتا ہے اُس نے راج کُمار کی ٹانگ کو میری ٹانگ سمجھ لیا ہو؟"

"تمہاری ٹانگ!" میں نے حیرت سے کہا۔ "کیا اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سانپ جسے تُم، اپنا پالتو سانپ کہتی، تمہیں ڈستا رہتا ہے؟"

"نہیں۔" اُوشا نے جواب دیا۔ "بلکہ یوں کہو کہ میں اپنے آپ کو اُس سے ڈسواتی رہتی ہوں۔ اُس کا زہر میری سب سے پیاری غذا ہے۔"

پھر یکایک ایک آہ بھر کر کہنے لگی۔ "کسے خبر تھی کہ قسمت کا لکھا یُوں میرے سامنے آئے گا۔ نجومی سچّے تھے۔ تقدیر سے بھاگ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے۔ شاید اِسی لیے میرے باپ نے مُجھے دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا تھا۔"

"یہ تُم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے حیرانی سے کہا۔ "تمہارے باپ نے تمہیں دریا

کی لہروں کے حوالے کر دیا تھا! اور ابھی تُم کہہ رہی تھیں کہ تم شیش ناگ کی بیٹی ہو!"

"دونوں باتیں سچّی ہیں۔" اُوشا نے کہا۔ "کیا تُم اُوشا کی، بد نصیب اُوشا کی کہانی سُنو گے؟ یہ کوئی لمبی کہانی نہیں۔ سُن لو۔ پھر جو جی میں آئے کرنا۔"

"سُناؤ۔" میں نے دِلچسپی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

اُوشا نے ایک سرد آہ بھری۔ پھر کہنے لگی۔ "میرا باپ پشکلاوتی کے مندر کا پروہت تھا۔۔۔۔۔۔"

"پشکاوتی!" میں یہ سُنتے ہی حیرت سے اُچھل پڑا۔

"کیا بات ہے؟" اُوشا نے مُجھے حیران ہوتے دیکھ کر کہا۔ "پشکلاوتی کا نام سُن کر تُم اُچھل کیوں پڑے ہو؟"

میں نے اپنی حیرانی پر قابو پاتے ہوئے یوں ہی بات بنائی کُچھ نہیں۔ بات یہ ہے کہ

پشکلاوتی کا مندر میں نے بھی دیکھا ہے۔ وہاں شیش ناگ کی مورتی ہے جو خالص سونے کی بنی ہوئی ہے۔ بڑی خوب صُورت مورتی ہے۔"

"ہاں۔" اُوشا نے کہا۔ "میں اُسی مندر کی بات کر رہی ہوں۔ میرا باپ اُسی مندر کا پروہت تھا۔ جب میں پیدا ہوئی تو میرے باپ نے بڑی خوشی منائی کیوں کہ اُس کے ہاں مُجھ سے پہلے کوئی اولاد نہیں تھی۔ لیکن جب نجومیوں نے میری قسمت کا زائچہ تیّار کیا اور حساب لگا کر میری تقدیر کا حال بتایا تو میرے باپ کی خوشی رنج اور افسوس میں بدل گئی۔ نجومیوں نے بتایا تھا کہ یہ لڑکی اپنے پالنے والے کے لیے مُصیبت کا باعث بنے گی اور اِس کی وجہ سے ایک سانپ اِس کے پالنے والے کو ڈسے گا۔ نجومیوں کا کہا میرے باپ کے لیے پتھّر کی لکیر تھا۔ اس نے مُجھے ایک صندوق میں ڈلوا کر دریائے سندھ کی لہروں کے حوالے کر دیا اور ساتھ ہی نجومیوں کی پیش گوئی بھی ایک علیحدہ کاغذ پر لکھ کر صندوق میں رکھوا دی تا کہ اگر کسی کو میری وجہ سے نقصان پہنچے تو خود اُس نقصان سے بری رہے۔

مُجھے جس شخص نے دریا کی لہروں سے نکالا تھا وہ ایک مچھیرا تھا۔ اُس نے ایک

سال تک اپنی بیٹی کی طرح میری پرورش کی۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک روز وہ دریا پر مچھلیاں پکڑنے گیا تو وہاں ایک ناگ نے اُسے ڈس لیا۔ اُس کے دوسرے دِن ہی اُس کی بیوی نے مُجھے اسی صندوق میں بند کیا اور دریا میں ڈال دیا اور یوں بد نصیب اُوشا دوسری بار دریا کی لہروں کے سپرد کر دی گئی۔

اس کے بعد قسمت نے مجھے ایک بازی گر کی جھولی میں ڈال دیا۔ وہ جگہ جگہ گھُوم پھِر کر تماشا دِکھاتا تھا۔ تین سال تک میری پرورش کرنے کے بعد اُس نے اپنے تماشے میں مُجھے بھی شامل کر لیا۔ اس نے مُجھے کئی کرتب سکھائے۔ تنی ہوئی رسّی پہ چلنا اور قلابازیاں کھانا وغیرہ۔

لیکن مُجھے اُس بازی گر کے ہاں صرف پانچ سال رہنا نصیب ہوا۔ وہ کبھی کسی ایک جگہ جم کر تو رہتا نہیں تھا۔ ایک بار پھِرتا پھراتا یہاں آیا اور راج محل کے سامنے والے میدان میں اپنا تماشا دِکھانے لگا۔ تماشا دیکھنے والوں میں سُندری نام کی ایک عورت تھی جو مہاراجا کے دربار کی رقّاصہ تھی۔ اُس نے میرے کرتب دیکھے تو مُجھے بازی گر سے مُنہ مانگے داموں خرید لیا اور یوں اُوشا بازی گر کے سائے سے

نکل کر مہاراجا پورس کے سائے میں آ گئی۔ سُندری نے بڑی محنت سے مُجھے ناچنا سکھایا اور یہ اُسی کی محنت کا نتیجہ ہے کہ آج میں مہاراجا کے دربار کی نامور رقّاصہ سمجھی جاتی ہوں۔ سُندری آج اِس دُنیا میں نہیں ہے لیکن میری روح آج بھی اُسے عقیدت سے سلام کرتی ہے۔"

اُوشا یہ کہہ کر خاموش ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "لیکن، وہ سانپ، اس کے متعلّق تُم نے کُچھ نہیں بتایا، وہ کہاسے آیا۔"

"وہ کہاں سے آیا، یہ میں خود بھی نہیں جانتی۔ وہ شروع ہی سے اُس صندُوق میں موجود ہے۔ شاید وہ جنم جنم کا میرا ساتھی ہے۔ میں اُسے امبر کہتی ہوں۔ میں شُروع ہی سے اُس کی اور اُس کے زہر کی عادی ہوں۔ لیکن مُجھے یہ گُمان تک نہ تھا کہ قسمت کا لکھا میرے آگے آئے گا۔"

"اُوشا! تُم نے بڑی خوب صورتی سے اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ایک بات اب بھی تمہارے خلاف جاتی ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ

جب تم اس معاملے میں بے قصور تھیں تو دربار سے غائب کیوں ہو گئی تھیں؟"

"میں خُود نہیں سمجھ سکی کہ یہ سب کیا ہوا اور کیسے ہوا۔" اُوشا کہنے لگی۔ "میں نہیں جانتی کہ یہاں کیوں اور کیسے آئی ہوں۔ یُوں لگتا ہے جیسے کوئی اَن دیکھی، اَن جانی طاقت مجُھے دربار سے اُٹھا کر یہاں لے آئی تھی، اور جب میں غار کی طرف بڑھی تھی تو جیسے کسی نے میرے کان میں کہا تھا "شیش ناگ کی بیٹی! جا، اندر چلی جا۔ تکشک مہاراج کا خادم دروازے پر پہرا دے گا۔ اِس کے ہوتے ہوئے کوئی تُجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ پر میں نہیں جانتی تھی کہ تُم یہاں تک پہنچ جاؤ گے۔ سچ سچ کہو کہ تُم یہاں کیسے پہنچے ہو؟ تمہیں کیسے پتا چلا کہ اُوشا یہاں ہے؟"

میں نے مُسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارے اِس سوال کا جواب دینا میرے لیے بہت مُشکل ہے۔ یُوں سمجھ لو کہ جس اَن دیکھی طاقت نے تمہیں یہاں پہنچایا ہے، وہی اَن دیکھی طاقت مجُھے یہاں لائی ہے۔ شاید اِس لیے کہ اُوشا اپنی کہانی انوشا کو سُنا سکے۔"

”ہاں، شاید قدرت کی یہی مرضی تھی“۔

میں چند لمحے خاموش رہا، پھِر بولا۔ ”تُم نے بتایا تھا کہ تمہارا باپ پشکلاوتی کے مندر کا پروہت تھا۔“

”ہاں۔“

”کیا وہ کنٹک قبیلے سے تعلّق رکھتا تھا؟“ میں نے پُوچھا۔ ”ہاں۔“ اُوشا نے جواب دیا۔

”کیا تمہارا دادا کنٹک قبیلے کا سردار تھا؟“

”ہاں۔“ اُوشا نے جواب دیا۔ ”لیکن تُم کیوں پُوچھتے ہو؟“

میں نے اُوشا کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اُس سے پوچھا ”کیا اُس سردار کی ایک بیٹی ٹیکسلا کے راجا امبھی سے اور دوسری بیٹی کشمیر میں تکشک ناگ کے مندر کے پریت سے بیاہی ہوئی تھی؟“

”تم یہ سب کُچھ کیوں پُوچھ رہے ہو؟“ اُوشا نے بے چینی سے کہا۔ ”تُم جانتے ہو کہ مُجھے تو میرے باپ نے پیدا ہوتے ہی دریا میں ڈال دیا تھا۔ میں کیا جانوں کہ میرے باپ کی ایک بہن تھی یا دو بہنیں تھیں اور کِس کی شادی کہاں ہوئی تھی۔ اب تو میرا باپ میرے تو میں اُسے بھی نہیں پہچان سکوں گی۔“

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا جی چاہا کہ اُسے بتا دوں۔ اپنے متعلّق سب کُچھ بتا دوں۔ چیخ چیخ کر اُس سے کہوں کہ:

”اُوشا، میں تمہارے دادا کنٹک قبیلے کے سردار کی اُس بیٹی کا لڑکا ہوں جس کی شادی ٹیکسلا کے راجا امبھی سے ہوئی تھی اور جسے راجا امبھی نے راج محل سے اِس لیے دُور کر دیا تھا کہ نجومیوں کے کہنے کے مطابق راج پاٹ سنبھالنا اِس لڑکے کی قسمت میں نہیں تھا۔ ہم دونوں کی مٹّی ایک ہی ہے۔ کنٹک قبیلے کی مٹّی۔ میری ماں تمہاری پھُوبھی تھی۔ تمہارا باپ میرا ماموں تھا۔

میں یہ سب کُچھ کہہ دینا چاہتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی اَن دیکھی طاقت

نے میرے ہونٹ سی دیے ہیں۔

اُوشا حیرانی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ خود میں بھی اُس کے دونوں ہاتھ تھامے ٹُکر ٹُکر اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خاصی دیر بعد یہ کیفیّت ختم ہوئی اور میں پھر اپنے آپ میں آ گیا۔ وہی انوشا بن گیا جو سارنگ بابا کے حکم پر اُوشا کی تلاش میں نکلا تھا۔

"چلو اُوشا۔ تمھیں دربار سے غائب ہوئے ایک مہینا ہو گیا ہے۔ مہاراجا پورس بہت پریشان ہیں۔"

اُوشا بغیر کُچھ کہے میرے ساتھ ہو لی۔ میں اُس کے ساتھ غار سے باہر آیا۔ تکشک مہاراج کا خادم ناگ جا چکا تھا۔ شاید اِس لیے کہ مُجھے غار تک پہنچانے کے بعد اُس کا کام ختم ہو چُکا تھا۔

میں اُوشا کو ساتھ لیے آگے بڑھا اور اندازے سے جنگل میں اُسی طرف کو ہو لیا جس طرف سے آیا تھا۔ جھاڑیوں اور درختوں کی جھُکی ہوئی شاخوں کو ہاتھوں سے

ہٹاتے ہوئے ہم نہ جانے کتنی دیر اُس خُوف ناک جنگل میں چلتے رہے۔ پھر جنگل ختم ہو گیا اور مُجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سامنے دُور تک ایک سیاہ دلدل پھیلی ہوئی ہے۔

آسمان پر چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اُس کی چاندنی اُس دلدل کو کُچھ اور خوفناک بنا رہی تھی۔ میں نے اندازہ کرنے کے لیے دلدل میں پاؤں رکھا، اور جب دیکھا کہ میرے قدم اُس میں دھنستے نہیں ہیں تو آگے بڑھنے لگا۔ لیکن دو ہی قدم اُٹھائے تھے کہ پیچھے سے اُوشا کی چیخ سُنائی دی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ دلدل کے اندر قدم رکھتے ہی وہ کمر تک دھنس گئی تھی۔

میں فوراً اُوشا کے پاس پہنچا اور اُسے کھینچ کر دلدل سے باہر نکال لیا۔ پھر میں نے اُسے اپنی پیٹھ پر ڈالا اور بڑے اطمینان سے دلدل پار کرنے لگا۔ اُوشا تو دلدل کے اندر قدم رکھتے ہی کمر تک دھنس گئی تھی لیکن میں اُوشا کو اپنی پیٹھ پر اٹھائے دلدل میں سے یوں گُزر رہا تھا جیسے وہ کوئی خُشک زمین ہو۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ لیکن اُوشا کے لیے۔ میرے لیے اب اِس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں رہی

تھی۔ سارنگ بابا کی مہربانی سے میں نہ جانے کیا سے کیا بن گیا تھا۔

دلدل عبُور کرنے کے بعد خُشک زمیں آئی تو میں نے اُوشا کو پیٹھ سے اُتار دیا۔ وہ بار بار حیرانی سے میرے پیروں کی طرف دیکھتی تھی جِن پر دلدل کی کیچڑ کا نشان تک نہ تھا۔ میں نے اُس کی حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک طرف قدم بڑھائے اور اُوشا بھی چُپ چاپ میرے ساتھ ہو لی۔

اسی طرح چلتے چلتے ہم، صُبح کے وقت ایک دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا دریا تھا جو کہیں آگے جا کر بڑے دریا میں جا ملتا تھا۔ ہم نے اُس کے کنارے پہنچ کر ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیا اور پھر اپنے اِرد گرد دیکھا۔ آس پاس کہیں کسی کشتی، کسی گھاٹ، کسی آدمی کا نشان نہ تھا۔ ہم کسی ایسی جگہ تھے جہاں پر آدمی بہت کم گُزرتا ہے۔ اُوشا نے پریشانی سے دریا کی لہروں کی طرف دیکھا پھر کہنے لگی:

”دلدل سے تو تُم گُزر آئے ہو۔ اب کیا کرو گے؟ یہاں تو کوئی کشتی وغیرہ بھی

نہیں ہے۔"

"گھبراؤ نہیں۔ کشتی نہیں ہے تو نہ سہی۔ آؤ میری پیٹھ سوار ہو جاؤ۔ یہ سمجھ لینا کہ میں تمہاری کشتی ہوں۔"

اُوشا میری پیٹھ پر سوار ہو گئی اور میں نے دریا کی طرف قدم بڑھائے۔ جھجکتے ہوئے نہیں بلکہ بڑے اطمینان سے اور پھر پانی پر یُوں چلنے لگا جیسے وہ پانی نہیں، چاندی کی موٹی اور بھاری چادر ہے۔ ذراسی دیر میں ہم دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔

لیکن دریا کے پار پہنچ کر میں نے اُوشا کو پیٹھ سے نہیں اُتارا بلکہ اُسی طرح اُسے پیٹھ پر اُٹھائے آگے بڑھتا گیا۔ کہیں دُور اُفق پر ایک شہر دِکھائی دے رہا تھا۔ اور اِس شہر میں مہاراجا کے محل کے اُونچے اُونچے مینار اِتنی دُور سے بھی صاف نظر آ رہے تھے۔

سارا دِن میں اُوشا کو اپنی پیٹھ پر اُٹھائے سفر کرتا رہا۔ شام ہوئی تو اب بھی وہ شہر

اتنی ہی دُور دکھائی دے رہا تھا، جتنا صُبح کے وقت۔ لیکن میں رُکا نہیں۔ شام ہو جانے کے باوجود چلتا رہا اور آخرکار ٹھیک آدھی رات کے وقت شہر کے بڑے دروازے پر جا پہنچا۔ یہ مہاراجا پورس ہی کی راجدھانی تھی۔

دروازے پر پہنچ کر میں نے اُوشا کو اپنی پیٹھ سے اُتارا۔ وہ بڑے مزے سے سو رہی تھی۔ میں نے اُسے دروازے کے قریب لِٹا دیا اور دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟" دروازے کی دوسری طرف سے پہرے دار آواز آئی۔

میں نے کہا۔ "میں اُوشا کو ڈھونڈ کر لایا ہوں۔ جلدی سے مہاراج کو خبر کرو۔"

پہرے دار نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ جلتی ہوئی شمع اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اُس شمع کی روشنی میں اُس نے اُوشا کی طرف دیکھا۔ شمع کی روشنی اُوشا کی آنکھوں پر پڑی تو وہ جاگ گئی۔"

"ارے! یہ تو سچ مُچ اُوشا رانی ہے۔" پہرے دار نے کہا۔ "سپاہیوں نے ملک کا چپّا چپّا دیکھ ڈالا لیکن اِس کا کوئی پتا نہیں چلا۔ یوں لگتا ہے جیسے آسمان سے ٹپک پڑی

ہے۔ چل، تُجھے ابھی مہاراج کے سامنے پیش کرتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے پہرے دار نے تیزی سے اُوشا کی کلائی تھام لی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے مُجھے دیکھا ہی نہیں۔ میں نے پہرے دار اور اُوشا کو وہیں چھوڑا اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہوئے محل کے اُس مہمان خانے کے دروازے پر جا پہنچا جہاں ہمیں ٹھہرایا گیا تھا۔ دروازے پر پہنچتے ہی سارنگ بابا کی آواز میرے کان میں پڑی۔ "لیجیئے مہاراج! آپ کی اُوشا مل گئی ہے۔"

میں یُوں چونکا جیسے ایک گہرے خواب سے جاگا ہوں۔ مہاراجا پورس کے ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھے اور میں انہیں اپنی آنکھوں سے لگائے ہوئے تھا کہ ایک دم کوئی چیز دھپ سے میرے قدموں کے قریب آکر گِری۔ مہاراجا پورس اپنے ہاتھ چھُڑا کر پیچھے ہٹ گئے اور اُس کے ساتھ ہی ایک ہلکی سی چیخ فضا میں گونج گئی۔ یہ چیخ اُوشا کی تھی۔

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اُوشا مہاراجا کے قدموں میں پڑی

تھی اور مہاراجا سے چند قدم پرے، دروازے کے قریب، وہ پہرے دار کھڑا تھا جسے میں نے شہر کے بڑے دروازے کے پاس دیکھا تھا۔

"کہاں سے ملی یہ؟" مہاراجا پورس کی غصّے بھری آواز گونجی۔

پہرے دار ابھی کُچھ جواب نہ دے پایا تھا کہ اُوشا تڑپ کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی:

"مہاراج! اس بے چارے سے کیا پوچھتے ہیں آپ؟ اُس سپیرے سے پوچھیئے جو ساری رات مُجھے اپنی بِین پر نچاتا رہا تھا۔ یہی مُجھے لے کے آیا ہے اور نہ جانے کتنی دُور سے اور کتنے دِن کا سفر طے کر کے جنگل، دلدل اور دریا عبور کر کے لایا ہے۔"

"کیا بکتی ہو۔" مہاراجا نے غصّے سے کہا۔ "سارنگ اور انوشا مہاراج تو ایک پل کے لیے بھی یہاں سے کہیں نہیں گئے۔ صاف صاف بتاؤ کہ تُم نے کس کے اشارے پر ہماری جان لینے کی کوشش کی تھی؟ سچ بولو گی تو شاید ہم تمہیں معاف

کر دیں۔“

”مہاراج!“ اُوشا نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”میں سچ کہہ رہی ہوں اور سچ ہی کہوں گی۔ میں شیش ناگ کی بیٹی ہوں اور شیش ناگ کی بیٹی جھوٹ بولنا نہیں جانتی۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ میں آپ کی یا بڑے راج کُمار کی جان لینے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی۔ نہ اپنے ارادے سے، اور نہ کسی کے اشارے پر۔“

”تو پھر یہ سب کُچھ کیسے ہوا؟ وہ سانپ جس نے ہمارے بڑے بیٹے کو ڈسا اور جو ہمیں ڈسنے والا تھا، وہ تمہارا سانپ تھا۔ پھر تُم دربار سے غائب ہو گئیں اور اب پورے ایک ماہ کے بعد آئی ہو۔ اگر تُم نے کوئی جُرم نہیں کیا تھا تو دربار سے کیوں غائب ہو گئیں؟“ ”مہاراج! میں ساری کہانی شروع سے آخر تک سُنائے دیتی ہوں۔ اِس کے بعد آپ جو فیصلہ کریں گے مُجھے منظور ہو گا۔“

ادھر مہاراجا پورس اور اُوشا میں تو یہ سوال جواب ہو رہے تھے اور اِدھر پہرے دار دروازے کے قریب کھڑا بے چین ہو رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُوشا کو مہاراجا

کے سامنے پیش کرنے پر اُسے بھاری انعام مِلے گا۔ مہاراجا نے اچانک اُس کی طرف نظریں اُٹھائیں تو اُس کی بے چینی کو سمجھ گئے۔ اُنہوں نے اُسی وقت اپنی انگلی سے سونے کی انگوٹھی اُتاری اور پہرے دار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"شاباش! یہ اور تمہارا انعام ہے!"

پہرے دار جھک کر آداب بجا لایا اور انگوٹھی لے لی۔ اُس نے ایک دفعہ پھر جھک کر سلام کیا اور اُلٹے پاؤں وہاں سے رُخصت ہو گیا۔

پہرے دار کے چلے جانے کے بعد اُوشا نے شروع سے آخر تک ساری کہانی سُنا دی۔ مہاراجا دیر تک خاموش رہے اور پھر سارنگ بابا سے کہنے لگے۔ "مہاراج، اُوشا نے جو کُچھ بیان کیا ہے وہ ایسا ہے کہ کسی کو اِس پر مُشکل ہی سے یقین آ سکتا ہے۔ آخر یہ کیسے ہو گیا کہ انوشا یہاں سے ایک پل کے لیے کہیں نہیں گئے اور اوشا کہتی ہے کہ انوشا اُسے بہت دُور سے، جنگل اور دلدل اور دریا عبور کر کے لائے ہیں!"

سارنگ بابا مُسکرا دیے اور کہنے لگے۔ ”مہاراج! انوشا میرا بیٹا ہے، ایسا بیٹا کہ جس کے لیے میں نے تکشک مہاراج کا جاپ کیا تھا، جو کُچھ ہوا وہ انوشا کے لیے معمولی بات ہے۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں، ہمیں اُوشا کی بات کے سچ ہونے کا پورا یقین ہے۔“

”اگر اِس کی بات سچ ہے تو یہ دربار سے غائب کیوں ہوئی تھی اور تیس دِن تک غائب کیوں رہی؟“

سارنگ بابا بولے۔ ”مہاراج، اِس دنیا پر نہ جانے کون سی اَن دیکھی، اَن جانی طاقتیں حکومت کرتی ہیں۔ جب معاملہ ایسی طاقتوں کا ہو تو کسی راجا، کسی مہاراجا کی طاقت کُچھ کام نہیں آتی۔ اُوشا پہلے دِن ہی آسکتی تھی، لیکن قدرت شاید آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ اِس دنیا کا طاقت ور سے طاقت ور انسان بھی اُس کے آگے بے بس ہے۔

”ہم سب قُدرت کے آگے بے بس ہیں۔“ مہاراجا نے کہا۔ ”کھلونوں کی طرح،

کمزور اور بے بس۔ قُدرت جب چاہتی ہے، بڑی بے دردی سے اِن کھلونوں کو توڑ ڈالتی ہے۔"

اس کے بعد وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہے اور پھر اُوشا سے مخاطب ہوئے "اوشا! تمہاری داستان ایسی نہیں ہے جس پر کوئی آسانی سے یقین کر لے، لیکن سارنگ بابا کہتے ہیں تو ہم بھی مانے لیتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا ہو گا، جیسا کہ تُم نے بیان کیا ہے۔ اب ہمیں یہ تو اطمینان ہو گیا ہے کہ جو کُچھ ہوا، اُس میں ہمارے کسی دُشمن کا ہاتھ نہیں تھا، لیکن ہم نہیں چاہتے کہ ایسی صورت پھر پیدا ہو اور اِس کی وجہ سے ہمیں پھر پریشانی اُٹھانی پڑے۔ سانپ کا ڈسا رسّی سے پناہ مانگتا ہے، اور دُودھ کا جلا چھاچھ پھُونک پھُونک کر پیتا ہے۔" یہ کہہ کر مہاراجا پورس ذرا دیر خاموش رہے، پھر کہنے لگے۔ "اس لیے تمہارے بارے میں ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ تم اب یہاں نہیں ہو گی۔ جہاں کہیں جانا چاہتی ہو، جا سکتی ہو۔ بتاؤ، کہاں جانا پسند کرو گی؟"

اُوشا نے ذرا دیر سوچا، پھر کہنے لگی۔ "پشکلاوتی۔"

”پشکلاوتی!“

”ہاں مہاراج۔ شیش ناگ کے مندر میں۔“

”لیکن وہاں تُم کیسے پہنچو گی؟“ مہاراجا نے کہا۔ ”اس کے لیے تمہیں راجا امبھی کے علاقے سے گُزرنا پڑے گا۔ وہ ہمارا جانی دُشمن ہے اور تمہارا ہمارے دربار میں ہونا اُس کے عِلم میں ہے۔ ایسے میں تُم پشکلاوتی کیسے جاسکو گی؟“

”ہم لے جائیں گے، مہاراج۔“ سارنگ بابا نے کہا۔ ”ہم اِسے پشکلاوتی لے جائیں گے۔“